بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

اس وقت ہندوستان کے طول وعرض میں ایک ہی مسئلہ موضوع بحث بنا ہوا ہے، اور اس کو ہندوستان کی برسر اقتدار جماعت کی طرف سے اس انداز اور شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے گویا ہندوستان کا سب سے اہم اور تشویشناک مسئلہ یہی ہو، اور یہ ہندوستان کے لیے بہت بڑا چیلنج اور اس کی تعمیر وترقی کی راہ میں کوئی نا قابل تسخیر رکاوٹ ہو۔ قارئین جانتے ہیں کہ اسلامی شریعت نے طلاق کو مشروع قرار دیا ہے، اور شوہر اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو طلاق واقع ہوجاتی ہے۔ طلاق دینے کے کئی طریقے ہیں، ایک لفظ یا ایک مرتبہ میں طلاق دے تو طلاق رجعی ہوتی ہے اور شوہر کو رجعت کا اختیار باقی رہتا ہے، اور طلاق کا یہی اچھا طریقہ بھی ہے، لیکن اگر کوئی شخص بیک لفظ یا بیک مجلس تین طلاق دے تب بھی طلاق پڑ جاتی ہے، اس صورت میں بیوی نکاح سے نکل جاتی ہے اور شوہر کے لیے رجعت کا حق باقی نہیں رہتا، تاوقتیکہ وہ دوسرے شخص سے نکاح نہ کرلے اور وہ اس کو اپنی مرضی سے طلاق نہ دیدے، جس کو شریعت یا قانون کی اصطلاح میں حلالہ کہا جاتا ہے۔

یہ اسلامی شریعت کا وہ مسئلہ ہے جو قرآن وسنت اور اجماع امت سے ثابت ہے، اور عہد نبوی سے لے کر آج تک اسی پر مسلمانوں کا عمل چلا آرہا ہے۔ ہندوستان ایک کثیر مذہبی ملک اور مختلف ومتنوع تہذیبوں کا گہوارہ ہے، اس کی مثال ایک ایسے چمن اور گلشن کی طرح ہے جس میں رنگ برنگ کے پھول ہوں، اور ان کی رنگا رنگی وبوقلمونی میں ہی اس کے حسن وجمال کا راز مضمر ہو، ہندوستان کی اس خوبصورتی کا مظہر اس کا سیکولر آئین اور جمہوری قوانین ہیں، جس کی رو سے ملک کے ہر باشندے کو اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق رہنے سہنے اور زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ لہذا اس ملک میں

اس کے خلاف اگر کوئی نظریہ تھوپا جائے، تو نہ صرف یہاں کے باشندوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت ہے، بلکہ اس کی زد براہ راست اس کے سیکولر دستور پر بھی پڑتی ہے۔اسی سیکولر دستور کی رو سے مسلمانوں کو اپنے عائلی وخانگی معاملات میں اپنی شریعت پر عمل کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے،اور یہ وہ شریعت ہے جو خالق کائنات کی طرف سے نازل کی ہوئی ہے اور اپنی تمام جزئیات کے ساتھ قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔

افسوس ہے کہ ملک کے سیکولرزم،اس کی جمہوریت اور دستور سے صرف نظر کرتے ہوئے اور ملک کو درپیش سنگین مسائل کو پس پشت ڈال کر برسر اقتدار جماعت کی طرف سے اسلامی شریعت میں مداخلت اور ترمیم کی منصوبہ بند کوشش کی جارہی ہے، اور یہاں کے باشندوں کی مذہبی آزادی سلب کر کے اس کی جگہ ایسا یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی سعی کی جارہی ہے، جو کسی بھی مذہب کے ماننے والے کے لیے قابل قبول اور لائق عمل نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ طلاق کے مسئلے میں لوگوں کے ذہنوں میں بہت غلط فہمی اور بدگمانی پائی جاتی ہے، خاص طور سے ذرائع ابلاغ اس کو اس انداز میں پیش کررہے ہیں گویا اسلام نے طلاق کی ترغیب دی ہو، حالانکہ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔اسلام اور اسلامی شریعت نے طلاق کو کبھی پسند نہیں کیا ہے اور نہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے، بلکہ اسلام میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ **أبغض الحلال إلی اللّٰہ الطلاق** (حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو جو سب سے ناپسند ہے وہ طلاق ہے) لیکن اس کے باوجود یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو دیدے تو وہ واقع بھی ہوجاتی ہے، حدیث پاک میں ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو سنجیدگی سے کوئی کرے تب بھی ہوجاتی ہیں اور ہنسی مذاق میں کرے تب بھی ہوجاتی ہیں،ان میں سے ایک طلاق بھی ہے۔

مگر درحقیقت طلاق زوجین (میاں بیوی) کے درمیان اختلاف اور کشاکش کی صورت میں آخری راستہ کے طور پر تجویز کی گئی ہے۔اجتماعی زندگی میں اختلاف اور باہمی کشاکش ایک فطری امر ہے،اور اس کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا،شوہر اور بیوی کے درمیان بھی اس طرح کی صورت حال پیدا ہوسکتی ہے، اور ہوتی رہتی ہے،مگر جلد ہی زائل بھی ہوجاتی ہے،کبھی کبھی دونوں کے درمیان اختلاف شدت اختیار کرلیتا ہے اور ایسی وسیع خلیج حائل ہوجاتی ہے جس کو پاٹنا مشکل ہوجاتا ہے،اسلام کی تعلیم

یہ ہے کہ دونوں کے درمیان اصلاح اور مصالحت کی حتی الامکان کوشش کی جائے، اور خوش گوار ازدواجی زندگی کو وجود میں لانے کے لیے کوئی کوشش اٹھانہ رکھی جائے، اس کے باوجود اگر بات نہ بن سکے اور دونوں کے درمیان علاحدگی یا طلاق ناگزیر ہوجائے، تو اس کی یہ صورت ہونی چاہئے کہ ایک طہر میں شوہر ایک طلاق دے، پھر دوسرا طہر آئے تو اس میں دوسری طلاق دے، ایک ہی وقت میں تین طلاق کے تیر چلا دینے کو اسلام نے پسند نہیں کیا ہے، اور آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ایسا ہوا ہے تو آپ نے اس پر اپنی سخت ناگواری کا اظہار کیا ہے، لیکن اگر کوئی یہ حرکت کردے تو پھر تیر کمان سے نکل چکا ہوتا ہے، اور تینوں طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں، اور بیوی اس کے لیے حرام ہوجاتی ہے۔

طلاق بظاہر ایک ناگوار و ناپسندیدہ عمل ہے، لیکن شدت اختلاف کے وقت کبھی کبھی ذہنی آسودگی اور سکون واطمینان کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے، اگر کسی قانون میں طلاق کی گنجائش نہ ہو اور بیوی شوہر کے دامن سے اس طرح وابستہ کردی جائے کہ کسی بھی حالت میں علاحدگی یا جدائی کا کوئی امکان ہی نہ ہو، تو ظلم وستم اور جبر وتعدی کے راہ پانے کا موقع مل جاتا ہے، چنانچہ جن مذاہب میں طلاق کا گزر نہیں ہے، ان میں بسا اوقات خواتین کے ساتھ جو چیرہ دستیاں ہوتی ہیں، ان کے تصور سے بھی کلیجہ منھ کو آنے لگتا ہے۔

ہندوستان میں اس وقت جو یہ مسئلہ چھیڑا گیا ہے، اس کے نتیجے میں خاص بات جو نظر آرہی ہے وہ یہ ہے کہ ملک کی تمام ملی تنظیمیں اور ہر مسلک کے لوگ اس کے خلاف متحد ہوکر صدائے احتجاج بلند کررہے ہیں، نوجوان طبقہ بھی حالات کی نزاکت کو محسوس کرکے شریعت کے تحفظ کے لیے پوری سنجیدگی کے ساتھ جدوجہد کررہا ہے، خاص طور سے عام مسلم خواتین کا رول تو بہت زیادہ قابل ستائش ہے، کہ ان کی ہمدردی کے نام پر جو چال چلی جارہی ہے وہ اس کے خطرات سے چوکنا ہیں، اور دام فریب میں آنے والی نہیں ہیں، کاش احساس وشعور کی یہ بیداری دیرپا اور پائیدار ہوجائے تو مسلمانوں کی حالت میں انقلاب رونما ہوجائے۔

ماخوذ: از تفسیر عزیزی

(مسلسل)

تفسیر سورۂ مطففین

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍO

اور اُس کی ملونی ہے تسنیم سے

یعنی بعض اوقات مجلس والے شراب میں کوئی اور چیز ملاتے بھی ہیں اس لیے فرمایا کہ جنت میں اس شراب خالص کے اندر جب کچھ ملانا چاہیں گے تو ایسا کرسکیں گے، اور وہ تسنیم ہے جس کو ملائیں گے۔

"تسنیم" کی تحقیق:

لغت میں تسنیم اس چیز کو کہتے ہیں جس کو خوشبو یا ذائقہ کے طور پر شراب میں ملایا جائے جیسے گلاب، یا مشک وغیرہ ہے اور "تسنیم" سنام سے مشتق ہے، سنام اونٹ کی کوہان کو کہتے ہیں (تو تسنیم کا معنی ہوا کوہان بنانا) چونکہ ایسی خوشبو والی چیزیں ڈالنے سے شراب میں بلبلے اٹھنے لگتے ہیں جو اونٹ کی کوہان کی شکل کے ہوتے ہیں اس لیے اس کو تسنیم کہتے ہیں۔

یہاں پر تسنیم سے مراد جنت کا ایک خاص چشمہ ہے جو تمام شرابوں سے بہتر اور لذیذ ہے، مقربین وسابقین کو تو خالص اسی سے پلائیں گے ابرار کو (تسنیم کے طور پر) گلاب ومشک ملانے کی طرح شراب میں اس کو تھوڑا سا ملا کر پلائیں گے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ "تسنیم" کا چشمہ جنت کی زمین سے جاری نہیں ہے بلکہ ہَوا میں جاری ہے، فضاء وہوا کے اندر اس کے جاری ہونے میں راز یہ ہے کہ وہ چشمہ محبتِ ذاتیہ الٰہیہ کا نمونہ وصورتِ مثالی ہے کہ وہ محبت بھی صورت ومحل کے تعین کے بغیر ہی تھی بلکہ محبوب کے حال وصفت کی تشخیص وتعیین کے بغیر مقربین کی ارواح کو فریفتہ کردیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ چشمہ عرش کے نیچے سے ابلتا ہے اور مقربین کے گھروں کے صحن میں گرتا ہے، چنانچہ اس کے حال میں فرماتے ہیں:

عيناً يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَo

وہ ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں نزدیک والے

یعنی ''تسنیم'' سے ہماری مراد وہ چشمہ ہے جس سے مقرب لوگ پیتے ہیں، حاصل کلام یہ ہے کہ مقربین خالص اسی سے پیتے ہیں اور ''ابرار'' کو اس سے تھوڑا سا گلاب کے طور پر شرابِ خالص میں ملا کر دیتے ہیں، اس لیے کہ مقربین اللہ کے ماسوا کی طرف مشغول نہیں ہوئے اور اللہ کی محبت میں کسی اور کی محبت کو نہیں ملایا، بخلاف ابرار کے کہ انھوں نے اللہ سے محبت اللہ کے افعال وصفات کے آثار کی وجہ سے کی تھی (یعنی اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام کی بدولت اس سے محبت تھی)

جب ابرار (نیکوکاروں) کا جنت میں نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے ذکر میں ان کی شراب نوشی کا ذکر فرمایا تو اب اس شراب نوشی کا نکتہ بیان فرماتے ہیں، تفصیل اس کی یہ ہے کہ اصل میں اس دن حق تعالیٰ کو منظور یہ ہے کہ کفار دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ جو ٹھٹھہ مذاق کیا کرتے تھے، اس کا بدلہ اسی طرح آج ان کی ہنسی مذاق اڑا کر لیا جائے، مگر اللہ کے نیک بندے کمال تمکین ووقار کی وجہ سے ان کی ہنسی اڑانے میں کچھ توقف کریں گے، تب ان کو شراب کے جام پلائے جائیں گے، جس سے وہ سرشار ہو جائیں گے اس سرشاری وفرحت کی وجہ سے ان کے وقار وتمکنت میں کچھ کمی آجائے گی، پھر تو وہ خوب اپنے ٹھٹھوں کا بدلہ لیں گے، چنانچہ فرماتے ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَo

وہ لوگ جو گنہگار ہیں، تھے ایمان والوں سے ہنسا کرتے

یعنی جو لوگ دنیا میں گناہ کرتے تھے جیسے اللہ کی آیات کا انکار، مخلوق کے حقوق پامال کرنا اور ناپ تول میں کمی کرنا، یہ دنیا میں ایمان لانے والے لوگوں کی ہنسی اڑاتے تھے کہ ان کو کیا بے ہودہ فکر دامن گیر ہوگئی ہے کہ سامنے نظر آنے والی لذتوں کو محض خیالی لذتوں کی توقع پر چھوڑتے ہیں، اور صرف اسی ہنسی پر بس نہیں کرتے تھے بلکہ:

وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ○

اور جب ہو کر نکلتے اُن کے پاس کو تو آپس میں آنکھ مارتے

یعنی مسلمانوں کے پاس سے جب گذرتے تو ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے کہ یہی وہ بے عقل، احمق لوگ ہیں جنھوں نے نقد لذتوں سے اپنے آپ کو جنت کی محض وہمی خیالی لذتوں کی وجہ سے محروم کر رکھا ہے۔

وَاِذَا انْقَلَبُوْا اِلٰى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ○

اور جب پھر کر جاتے اپنے گھر پھر جاتے باتیں بناتے

یعنی یہ کافر لوگ جب لوٹ کر گھر جاتے تو گھر میں دنیاوی لذتوں کا مختلف ساز وسامان دیکھتے، خوبصورت عورتیں، نوکر چاکر، نفیس قسم کے فرش، مکلّف برتن، عمدہ عمدہ کھانے، پینے کے لیے ٹھنڈے خوشبودار مختلف مشروبات تو وہ یہ سمجھتے کہ یہ سب کچھ ہمیں ہمارے عقیدۂ انکارِ آخرت کی وجہ سے ملا ہے، کہ اس دن کا ہمیں کچھ خوف وڈر نہیں ہے اور مسلمان ان نعمتوں سے اس وجہ سے محروم ہیں کہ وہ جنت کی موہوم نعمتوں کی توقع اور جہنم کے خیالی عذاب کے ڈر سے ان سب سے دست بردار ہوئے بیٹھے ہیں، ان کی مثال تو اس مجنون جیسی ہے جو بہت مفید اور لطیف غذاؤں سے ڈرتا اور پرہیز کرتا ہے، اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر وہ کافر لوگ خوش طبعی کی باتیں کرنے لگ جاتے، خوش گپیاں کرنے لگ جاتے۔

وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ○

اور جب ان کو دیکھتے کہتے بیشک یہ لوگ بہک رہے ہیں

یعنی جب مسلمانوں کو دیکھتے کہ طاعات وعبادات میں سخت مشقت وجانفشانی کر رہے ہیں، لباس بھی اچھا نہیں پہنتے، کھانا بھی خشک وبے مزہ کھاتے ہیں، سخت گرمی میں روزے رکھتے ہیں تو کہتے ''بیشک یہ لوگ تو بھٹکے ہوئے ہیں'' کہ وہمی خیالی لذتوں کو سامنے موجود لذتوں پر ترجیح دیتے ہیں، اور ان بے مقصد مشقتوں کا نام حقیقی کمالات رکھا ہوا ہے۔

وَمَا اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ o

اور اُن کو بھیجا نہیں اُن پر نگہبان بنا کر

یعنی کافروں کو مسلمانوں کے اوپر نگران بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے کہ وہ ان کی نگرانی کرتے رہیں کہیں سیدھی راہ سے ہٹ تو نہیں گئے، اور یہ کہ ہر مجلس میں ان کا پیچھا کریں، طعن وتشنیع کرتے پھریں، اوران پر پھبتیاں اڑائیں اورآوازے کسیں۔

یہ کفار اس معاملے میں اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ پہلے تو مسلمانوں کو دیکھ دیکھ کر حقارت سے ہنستے، پھر غمزے واشارے کرتے، اس کے بعد ان کے پسِ پشت ان کی پھبتیاں اڑاتے، پھر اس سے بھی بڑھ کر منھ پر ان کو گمراہ کہتے (مسلمانوں کے متعلق کفار کے یہ چار حال اسی ترتیب سے یہاں بیان فرمائے ہیں)

مسلمانوں کی اہانت میں کفار کے چار افعال بالترتیب بیان کرنے میں نکتہ:

اور کافروں کی ان چار حالتوں کو اس ترتیب سے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی آدمی کو کسی کی کوئی بات ناپسند ہوتی ہے تو سب سے پہلے وہ اس پر حقارت سے ہنستا ہے، جب نفرت مزید بڑھتی ہے تو اپنے مزاج ومذاق کے لوگوں کو چشم وابرو سے اشارے کرکے بتاتا ہے تاکہ وہ بھی اس کی اہانت میں شامل ہوں، جب نفرت انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو غائبانہ بھی اس پر پھبتیاں کستا اور اس کے لطیفے بنا بنا کر ہنستا ہنساتا ہے، اور جب نفرت حد سے بڑھ جاتی ہے تو پھر برسرِ عام، آمنے سامنے اس کے منھ پر اس کو احمق، جاہل اور گمراہ کہنا شروع کردیتا ہے، اس وجہ سے اِن آیات میں اس ترتیب کی رعایت فرمائی ہے۔

اور کافروں کا یہ ظلم بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کو تسلی کے طور پر ارشاد ہوتا ہے کہ کفار کا یہ ظلم یوں ہی بے کار نہیں جائے گا بلکہ جزا کے دن اس ظلم کا بدلہ لیں گے، چنانچہ فرمایا:

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ o

سو آج ایمان والے منکروں سے ہنستے ہیں

یعنی جو لوگ ایمان لائے تھے، اور ایمانی قوت کے ساتھ نفسانی لذات پر حقیقی کمالات کو ترجیح دیتے ہوئے اختیار کیا تھا، وہ آج ان کفار پر ہنستے ہیں جو کمالات کے منکر اور سارا کمال دنیاوی لذتوں

میں ہی سمجھتے تھے، آج مسلمان ان کی کوتاہ اندیشی، حماقت پر ہنستے ہیں کہ کیسی فانی وخسیس چیز کو کتنی نفیس اور ہمیشہ رہنے والی چیز پر انھوں نے ترجیح دی تھی اور اب دوزخ میں طوق وزنجیر کے اندر جکڑے ہوئے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے دوزخ کا ایک دروازہ جنت کی طرف کھولا جائے گا اور جہنم کے نگراں فرشتے کفار سے کہیں گے جلدی آؤ جنت کی طرف وہ طوق وزنجیر میں جکڑے گرتے پڑتے اس کی طرف آئیں گے جب قریب پہنچیں گے تو دروازہ بند کردیا جائے گا اور دوسری طرف ایک دروازہ کھول دیا جائے گا کہ ادھر سے آؤ، یہ گرتے پڑتے ادھر دوڑیں گے جب اس کے قریب پہنچیں گے تو وہ بھی بند کردیا جائے گا اسی طرح یہ تماشہ ان کے ساتھ ہوتا رہے گا اور مسلمان جنت میں بیٹھے جب یہ نظارہ دیکھیں گے تو ہنسیں گے لیکن مسلمان کافروں کا یہ تماشہ دیکھنے کے باوجود ہنسی میں تمکنت، وقار اور سنجیدگی کے اندر ہی رہیں گے، نہ آنکھوں سے ایک دوسرے کو اشارے کریں گے، نہ پھبتیاں اڑائیں گے اور نہ ہی اپنی مجالس میں غائبانہ ان کی برائی بیان کریں گے جس طرح دنیا میں کفار ان کے ساتھ کرتے تھے، بلکہ باوجود اس عجیب تماشہ کے کہ دنیا میں اس طرح کے تماشوں کا نظارہ کرنے کے لیے لوگ دور دور جاتے ہیں، وہ اپنی جگہ سے ہلیں گے بھی نہیں چنانچہ فرمایا:

عَلَى الْاَرَائِكِ يَنْظُرُوْنَ○

تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہیں

یعنی ان سایہ دار تختوں پر ہی بیٹھے دیکھتے ہیں اور آپس میں کمال تمکنت کے ساتھ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں:

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ○

اب بدلا پایا ہے منکروں نے جیسا کچھ کہ کرتے تھے

یعنی کیا کفار نے اپنے اعمال کی سزا پائی ہے، وہ اعمال جو دنیا میں کرتے تھے جیسے ٹھٹھہ، غمزہ کرنا، پھبتیاں کسنا اور گمراہ کہنا وغیرہ۔

تمت سورة المطففين والحمدلله

مقدمہ سورۂ انشقت

سورۂ انشقت (انشقاق) مکی ہے، اس میں پچیس آیات، ایک سونو (۱۰۹) اور چار سوتیس (۴۳۰) حروف ہیں۔

سورۂ مطففین کے ساتھ ربط کی وجوہ

اس سورت کا ربط سورۂ مطففین کے ساتھ مضامین ومعانی دونوں اعتبار سے بالکل ظاہر ہے، دونوں کا مضمون ومعنی قریب قریب ہے۔ سورۂ مطففین میں ہے:

(۱) "وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ — وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ" یہی مضمون سورۂ انشقاق میں یوں ہے "يَدْعُوْ ثُبُوْرًا"

(۲) سورۂ مطففین میں ہے "اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَبْعُوْثُوْنَ" اس سورت میں یہ مضمون اس طرح ہے "اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَحُوْرَ" سورۂ مطففین میں ہے "يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ" اور اس سورت میں یہ بات اس طرح ہے "فَمُلٰقِيْهِ"

(۳) سورۂ مطففین میں یہ بیان ہوا ہے کہ مرنے کے بعد نیک لوگوں اور بُرے لوگوں کے اعمال نامے علّیین اور سجّین کے دفتر (رجسٹر) میں داخل ہوں گے، اس سورت میں بھی اعمال ناموں کے متعلق یہ مذکور ہے کہ حشر کے دن وہ دائیں یا بائیں ہاتھ میں تھمائے جائیں گے۔

(۴) سورۂ مطففین میں کافروں کا قرآن کی تکذیب کرنے کو ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے: "اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ" اور یہی بات اس سورت میں ان الفاظ کے ساتھ ہے "وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ"

(۵) سورۂ تطفیف میں ہے "اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ" اِس سورت میں یوں ہے "يَصْلٰى سَعِيْرًا"

(۶) سورۂ تطفیف میں اہل نجات کے متعلق ہے "تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ" اور یہ بھی ہے "فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ" اِس سورت میں یہ مضمون اس طرح ہے "وَيَنْقَلِبُ اِلٰى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا"

(۷) سورۂ تطفیف میں کافروں کا مسلمانوں کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کو یوں بیان فرمایا ہے:

"فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ، وَإِذَا انْقَلَبُوْٓا إِلٰٓى أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ" اس سورت میں یوں فرمایا "كَانَ فِيْٓ أَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا" علی ہذا القیاس غور وتامل سے مناسبت کلی ظاہر ہوتی ہے۔

وجہ تسمیہ

اس سورہ کا نام "انشقت" اور "انشقاق" اس وجہ سے رکھا ہے کہ (انشقاق کا معنی ہے پھٹنا) اس میں شروع میں ہی قیامت کے دن اللہ کے حکم سے آسمان کا پھٹنا بیان ہوا ہے۔

اس واقعے میں انسان کے اوپر بہت بڑی حجت قائم کی گئی ہے، کہ آسمان جیسی عظیم، اور بلند ترین مخلوق بغیر ثواب یا عذاب کی توقع کے پھٹ جانے کا دشوار ترین عمل محض اللہ تعالیٰ کے حکم سے بجا لایا، تو انسان جو آسمان کے مقابلے میں بہت کمزور وذلیل ہے، اور وہ عذاب یا ثواب کی توقع بھی رکھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے آسان حکم کو کیوں بجا نہ لائے حالانکہ وہ حکم ایسا دشوار وسخت بھی نہیں ہے۔

تمت المقدمة

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

صفحہ ۴۷ کا بقیہ

ہم دل کی گہرائیوں سے عالم اسلام کے مقبول قائد جناب رجب طیب اُردگان اور ان کے ساتھیوں کے لیے نیک خواہشات پیش کرتے ہیں، اور اُن ٹرکی عوام کو مبارک باد دیتے ہیں، جنھوں نے اپنے عظیم کردار سے اپنی قوم کا سر بلند کیا، بالخصوص اُن شہداء کے لیے دعاء مغفرت کرتے ہیں، جنھوں نے اِس بغاوت کو کچلنے میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا، اللہ تعالیٰ اُن سب کو اپنی رحمت کی آغوش میں جگہ عطا فرمائیں، آمین۔

ہماری دعا ہے کہ رجب طیب اُردگان جیسے رہنما اِسی طرح عالم اسلام کی قیادت کریں، جیسے اُن کے پیش روخلافتِ عثمانیہ کے خلفاء کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ عالم اسلام کو ہر طرح کے شرور وفتن اور داخلی اور خارجی انتشار سے محفوظ رکھیں، آمین۔

الازہار المربوعہ
(مسلسل)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

اضطراب متن:

مجیب نے متن میں یہ اضطراب دکھایا ہے کہ ''عبداللہ بن علی بن السائب کی روایت میں کبھی تو اس کو رکانہ کا قصہ اوران کی بیوی کا نام سہیمہ بتایا جاتا ہے، اور کبھی رکانہ کے باپ عبد یزید کا قصہ کہا جاتا ہے اور بیوی کا نام ہشیمہ لیا جاتا ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ رکانہ حضور کے پاس آئے اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق بتہ دی، اور قسم خدا کی میں نے ایک طلاق مراد لی ہے۔ اور کبھی یہ بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے جب پوچھا کہ اس سے تم نے کے طلاق مراد لی؟ تو انھوں نے کہا کہ ایک اور پھر رسول اللہ ﷺ نے اُن سے قسم لی اور انھوں نے قسم کھا کر کہا کہ ایک طلاق مراد لی ہے، ......اس قسم کے اور بھی اختلافات سندی متنی ہیں۔ (آثار بلفظہ ص ۶۲)

جواب:- اولاً ناظرین مجیب کی منقولہ بالا عبارت غور سے پڑھیں، جو اختلافات انھوں نے ذکر کیے ہیں وہ بنا برقول مجیب صرف ابن السائب کی طریقوں میں ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبیر کے طرق ان اختلافات سے پاک ہیں، پس علی الاطلاق بتہ والی روایت کو مضطرب المتن کہنا غلط بیانی ہے، زیادہ سے زیادہ صرف ابن السائب کے طرق کو مضطرب کہیے، لیکن ان کے اضطراب سے زبیر کے طرق کا مضطرب ہونا لازم نہیں آتا اور چونکہ وہ استدلال کے لیے کافی ہیں، اس لیے ابن السائب کے طرق کا اضطراب ہمارے لیے کچھ مضر نہیں۔

ثانیاً:- پہلا اختلاف جو مجیب نے ذکر کیا ہے، وہ ابن السائب کے چوتھے طریق (جو اضطراب سند کے ذیل میں نقل کیا گیا ہے) پر مبنی ہے، اور بتایا جا چکا ہے کہ اس طریق میں یہ واقعہ عبد

یزید کا ہرگز ہرگز نہیں بتایا گیا ہے، لہذا یہ بھی مجیب کی غلط بیانی ہے۔ ہاں اس طریق میں صاحب واقعہ کی بی بی کا نام ہشیمہ ضرور بتایا گیا ہے، لیکن اضطراب سند کی بحث میں نہایت مدلل طور پر بتایا جا چکا ہے کہ یہ روایت وہم ہے اور دیگر ثقات کی روایت کے خلاف ہے، پس دوسری روایتیں اس سے ارجح ہیں، اور ترجیح کے بعد اضطراب باقی نہ رہا۔ مجیب کو معلوم ہونا چاہئے کہ امام شافعی کے تین شاگرد ربیع، ابن السرح، ابوثور، نام اور ان کے علاوہ کم سے کم تین اور شاگردوں نے تو یہ بیان کیا ہے کہ صاحب واقعہ کی بی بی کا نام سہیمہ ہے، اور صرف ایک نے کہا ہے کہ ہشیمہ ہے، پس بنا بر احوال محدثین چھ کا بیان ایک کے بیان سے زیادہ معتبر واقوی وقابل قبول ہے۔

ثالثاً: - تیسرا اختلاف جو مجیب نے ذکر کیا ہے اس میں بھی سخت غلط بیانی سے کام لیا ہے، مجیب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف بھی ابن السائب کے طرق متحدہ میں پایا جاتا ہے، حالانکہ یہ غلط ہے، ابن السائب کے تمام طرق کا متفقہ بیان یہ ہے کہ رکانہ نے حاضر ہو کر بلفظ بتہ طلاق دینا بیان کیا اور خود ہی قسم کھا کر ایک طلاق کی نیت کرنا بھی بیان کیا۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان سے ایک طلاق کے ارادہ پر قسم لی، ابن السائب کے کسی طریق میں اس کے خلاف مذکور نہیں ہے۔ ہمارے اس بیان سے آپ نے یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ آنحضرت کا قسم دے کر نیت طلاق کو پوچھنا تمام روایتوں میں چاہے بطریق ابن السائب ہوں یا بطریق زبیر مذکور ہے، پس اس کو بعض روایتوں کے ساتھ خاص کرنا، (اور اس کو کبھی کے لفظ کے ماتحت ذکر کرنا) دوسری غلط بیانی ہے۔

ہاں یہ بات صحیح ہے کہ ابن السائب کے طرق میں ایک بار از خود رکانہ کا قسم کھا کر اس کی نیت بیان کرنا مذکور ہے اور اس کا ذکر زبیر کے طرق میں نہیں۔

لہذا ابن السائب و زبیر کے طرق باہم مختلف ہوئے، تو عرض ہے کہ طرق ابن السائب وطرق زبیر کے باہمی اختلاف کا ذکر مجیب نے نہیں کیا ہے، بلکہ انھوں نے صرف ابن السائب کی روایت کا نام لیا ہے۔ اس لیے یہ اختلاف تو ان کی مراد ہو نہیں سکتا، تاہم تبرعاً میں اس کا جواب دیے دیتا ہوں، فاقول: اولاً کہ زبیر کے طرق از خود قسم کھانے سے ساکت ہیں اور سکوت موجب اختلاف نہیں ہوتا۔ مجیب صاحب اصول محدثین کا مطالعہ کریں اور کم از کم امیر یمانی کا بھی قول پھر پڑھیں **الساکت لا ینسب الیہ وفاق ولا خلاف** جس کا ترجمہ خود آپ کی زبانی یہ ہے کہ خاموش رہنے

والے کی طرف اتفاق یا اختلاف کسی کو منسوب نہیں کیا جا سکتا'' (ص ۳۴)

ثانیاً:- ان دونوں میں جمع یوں ممکن ہے کہ ابن السائب نے پہلی بار کی قسم کو یاد رکھا اور ذکر کیا اور زبیر بھول گئے۔ اس لیے ذکر نہ کر سکے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ زبیر نے قصداً قصہ کو مختصر کر دیا ہو، الی غیر ذلک، اور امکان اضطراب کا دعویٰ بالکل لغو ہے۔

ثالثاً:- یہ اور مجیب کے باقی تمام وجوہ اختلاف نفس مسئلہ میں کچھ مؤثر نہیں ہیں، اس لیے کہ یہ سارے اختلافات (بفرض وجود ہا المحال) امور خارجہ میں ہیں، اور میں مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کے حوالہ سے بتا چکا ہوں کہ امور خارجہ میں اختلافات کے پائے جانے سے نفس مسئلہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

رابعاً:- میں مجیب صاحب سے پوچھتا ہوں کہ جو اختلاف آپ نے متن حدیث بتہ میں دکھائے ہیں، اس قسم کے اختلافات صحیحین کی حدیثوں میں بھی ہوں تو وہ حدیثیں نامقبول ہو جائیں گی یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اور اگر اثبات میں جواب ہے تو صحیحین کی تمام حدیثوں کی صحت پر اجماع کہنا غلط ہے، اگر یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آتی ہو تو ہمت کر کے ''ہاں'' کہہ دیجئے، اس کے بعد دیکھیے کہ صحیحین کی کتنی حدیثوں میں اس قسم کے اختلافات دکھائے جاتے ہیں، ہمت ہو تو بولیے، ورنہ اپنا یہ قول واپس لیجئے کہ حدیث بتہ کے متن میں اضطراب ہے۔

من نہ گویم کہ ایں مکن، آں کن مصلحت بیں و کار آسان کن

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''اسی وجہ سے اجلہ محدثین نے اس کو مضطرب قرار دیا ہے اور محمد بن اسحاق کی روایت ثلاث کو اس پر ترجیح دی ہے'' (ص ۶۲)

جواب:- مجیب نے منقولہ بالا عبارت میں دو دعویٰ کیے ہیں، ایک یہ کہ ''اجلۂ محدثین نے اس (حدیث بتہ) کو مضطرب قرار دیا ہے''، دوسرا یہ کہ ''ابن اسحاق کی روایت ثلاث کو اس پر (یعنی حدیث بتہ پر) ترجیح دی ہے''۔

اب ناظرین آثار کو سامنے رکھ کر بتائیں کہ دوسرے دعوے کے ثبوت میں مجیب نے کس محدث کا نام لیا ہے؟ کیا یہ کھلی ہوئی ابلہ فریبی نہیں ہے کہ نام تو اجلہ محدثین کا لیا، لیکن دوسرے دعوے

کے ثبوت میں کسی معمولی محدث کا قول ہی نقل نہیں کیا۔ اسی سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مجیب نے دوسرے دعوے میں صریح غلط بیانی سے کام لیا ہے، ہاں اگر اپنے اصول کی بنا پر دس بیس [(۱)] اجلۂ محدثین کے اقوال اس کے ثبوت میں پیش کریں تو غلط بیانی کے جرم سے براءت ہوسکتی ہے۔

اب رہا پہلا دعویٰ تو ظاہر نظر میں مجیب کے نقل کردہ قول بخاری وقول عقیلی سے اس کا ثبوت ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ دعویٰ بھی بالکل بے ثبوت ہے اور بخاری یا عقیلی کا قول ہرگز ہرگز اس پر دلالت نہیں کرتا۔ اس لیے کہ بخاری و عقیلی کی مراد اضطراب سے اضطراب اصطلاحی نہیں ہے، بلکہ لغوی اضطراب مراد ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے ایک دوسرے قول میں بیان اضطراب کے ساتھ لفظ بتہ سے طلاق دینے کو ترجیح بھی دی ہے اور ظاہر ہے کہ ترجیح کے بعد اضطراب نہیں رہتا، پس اگر اضطراب سے اصطلاحی اضطراب مراد ہو، تو بخاری کا کلام متعارض ہوجائے گا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اضطراب سے اصطلاحی اضطراب مراد نہیں ہے بلکہ لغوی، یا یوں سمجھئے کہ بخاری نے ظاہر کے لحاظ سے اضطراب کا ذکر کر تو دیا، لیکن اس کا جواب بھی دے دیا ہے۔ اسی طرح عقیلی کے کلام میں بھی اضطراب سے مطلق اختلاف مراد ہے، اور اگر وہ اختلاف مراد ہو جس کو اصطلاح میں اضطراب کہتے ہیں تو عقیلی کا کلام غلط ہوجائے گا، اس لیے کہ بخاری نے ترجیح دے کر اضطراب اصطلاحی کی جڑ کاٹ دی ہے، نیز یہ کلام اس لیے بھی غلط ہوجائے گا کہ جب تک جمع وترجیح ناممکن نہ ہو تو اصطلاحی اضطراب کا دعویٰ غلط ہے، اور یہاں جمع وترجیح ناممکن نہیں ہے جیسا کہ مفصلاً بیان کیا گیا۔ حاصل کلام یہ کہ اگر اضطراب سے مطلق اختلاف مراد ہے تو ہم کو مضر نہیں جیسا کہ مجیب اور مولانا مبارک پوری کی عبارتوں سے ثابت کیا جاچکا۔ اور اگر اصطلاحی اضطراب مراد ہے تو جمع وترجیح کا ناممکن ہونا ثابت کیا جائے ورنہ بخاری و عقیلی کے اقوال غلط ہوجائیں گے۔

مجیب صاحب کی یہ کارروائی بھی قابل ملاحظہ ہے کہ بخاری کا جو قول انھوں نے نقل کیا ہے اس کے بعد ہی والی سطر میں بخاری کا دوسرا قول بھی ہے جس سے بتہ کی ترجیح اور اس کی اصحیت کا اظہار ہوتا ہے، اس کو نقل نہیں کرتے، مجیب نے بخاری و عقیلی کے علاوہ ابن حجر اور ابن الاثیر کی عبارتیں بھی نقل کی ہیں، لیکن ان عبارتوں کو دعویٰ اضطراب کے ثبوت میں نقل کرنا کھلا ہوا فریب اور ان کو ثبوت

---

(۱) بار بار بتایا جاچکا ہے کہ مجیب کے نزدیک جمع کا اطلاق دس بیس سے کم پر نہیں ہوتا کما یظہر من قولہ فی ص ۱۳۹، ۱۲ منہ

اضطراب پر دال کہنا غلط بیانی ہے۔

ناظرین آثار میں بچشم خود دیکھ لیں کہ ان عبارتوں میں صرف اختلاف اسناد کا ذکر ہے، اور مطلق اختلاف سے اضطراب ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ روایات مختلفہ ایک درجہ کی نہ ہوں اور ان میں جمع ناممکن ہے (دیکھو آثار ص ۳۶ و ابکار ص ۱۷۶)

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

اور حدیث مسند کی کسی محدث نے تصحیح نہیں کی ہے، ہاں صرف ابویعلی کا نام لیا جاتا ہے کہ انھوں نے تصحیح کی ہے لیکن یہ نقل کچھ مفید نہیں تاوقتیکہ یہ نہ ثابت ہو کہ ابویعلیٰ نے صرف اسناد کی نہیں بلکہ متن کی بھی تصحیح کی ہے و دونہ خرط القتاد

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''اولاً یہ بتایا جائے کہ جن پانچ حضرات نے بخیال آپ کے بتہ والی روایت کی تصحیح کی ہے انھوں نے سند اور متن دونوں کے تصحیح کی تشریح کی ہے، .... تو ان کی عبارتوں کو پیش کیجئے، اور اگر نہیں تو اس قسم کے فریب سے کب تک آپ فائدہ اٹھا سکتے ہیں،'' (ص ۶۳)

جواب:- شاید مجیب نے قسم کھائی ہے کہ کوئی بات سمجھ کر نہ لکھیں گے، ناظرین اوراق سابقہ میں پڑھ چکے ہیں کہ ابوداؤد نے تو صراحۃً حدیث بتہ کے متن کی تصحیح کی ہے، رہی صحت اسناد تو وہ بنا بر اصول مجیب صرف ابوداؤد کے سکوت سے ثابت ہو جاتی ہے، حاکم کی تصحیح کا حال بحث اضطراب سے ذرا پہلے معلوم ہو چکا ہے، دارقطنی نے ابوداؤد کی تصحیح کو ذکر کرکے برقرار رکھا ہے، اور ابوداؤد نے متن و اسناد دونوں کی تصحیح کی ہے، طنافسی کے الفاظ باب اول میں زیر حدیث سوم نقل کیے گئے ہیں، ابن حبان کے الفاظ البتہ سامنے نہیں ہیں، لیکن چونکہ انھوں نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں درج کیا ہے اس لیے ان کے نزدیک بھی یہ حدیث از روئے متن بے شبہہ صحیح ہے ورنہ صحیح میں درج ہونے کے قابل نہ رہے گی۔ برخلاف ابویعلی کے کہ انھوں نے نہ تو صحت کا التزام کرکے حدیث مسند کو ذکر کیا ہے، نہ حدیث مسند کی اسناد و متن دونوں کی صحت کی تصریح کی ہے، پس ان کی تصحیح میں یہ احتمال باقی رہ جائے گا کہ ممکن ہے انھوں نے صرف اسناد کے لحاظ سے تصحیح کر دی ہو، اب اگر مجیب مدعی ہیں کہ انھوں نے سند و متن دونوں کی تصحیح کی ہے تو ان کی عبارت پیش کرکے ثابت کریں ورنہ جتنے الفاظ انھوں نے یہاں پر

میری نسبت لکھے ہیں اور جو خیر خواہانہ مشورہ مجھے دیا ہے وہ سب اپنے حق میں سمجھیں۔

صاحب آثار لکھتے ہیں:

ثانیاً:- میں .... بتا چکا ہوں کہ ابن اسحاق کی حدیث کے متن میں کوئی علت نہیں، اور حافظ ابن حجر کے کلام کے سمجھنے میں مولف نے فاش غلطی کی ہے، اب اگر اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے تو صرف سند کی علت اور سند کی خرابی کی وجہ سے، اور میں بتا چکا ہوں کہ جمہور محدثین وفقہاء نے اس سند کی تصحیح وتحسین کی ہے، یہاں اب چند کے نام اور کتاب کا حوالہ دیتا ہوں (اس کے بعد بارہ نام لکھے ہیں)

جواب:- ناظرین اس باب کی حدیث دوم کا ابتدائی مبحث پڑھ کر معلوم کر سکتے ہیں کہ ابن اسحاق کی حدیث کا متن علت سے کسی طرح پاک نہیں ہے، اور ابن حجر کا کلام خود مجیب نے قطعاً نہیں سمجھا ہے، لہذا جس طرح ابن اسحاق کی حدیث کی سند پر اعتراض ہے اسی طرح اس کے متن پر بھی اعتراض ہے۔ پس اگر اس کی دوسری حدیث کے موقع پر اس سند کی تصحیح یا تحسین محدثین نے کی ہو تو اس سے اس حدیث کی تصحیح یا تحسین لازم نہیں آتی، علاوہ بریں مجیب صاحب نے آثار ص ۹۳ میں لکھا ہے کہ ''پھر کسی خاص حدیث کی تصحیح یا تحسین راوی کی کل حدیث کی تصحیح یا تحسین کو مستلزم نہیں'' لہذا اگر اس سند سے کسی حدیث کو محدثین نے صحیح یا حسن کہا تو اس سند سے جتنی حدیثیں مروی ہوں ان سب کی تصحیح یا تحسین لازم نہیں آسکتی، لہذا روایت مسند کی تصحیح وتحسین کے ثابت کرنے کے لیے کسی دوسری حدیث کی تحسین وتصحیح کا ذکر کہاں کی دیانت ہے؟

پھر یہ بھی قابل ملاحظہ بات ہے کہ:

۱- یہاں مجیب نے ترمذی کی تصحیح کا حوالہ بھی دیا ہے حالانکہ آثار ص ۹۳ اور ص ۸۲ میں لکھ چکے ہیں کہ ''ترمذی احادیث کی تحسین اور تصحیح میں متساہل ہیں'' مجیب صاحب بتائیں کہ کیا میرے لیے تو ترمذی متساہل اور آپ کے لیے نہیں ہیں؟ آخر یہ کہاں کی دیانت داری ہے۔

۲- حاکم کی تصحیح کا حوالہ بھی دیا ہے، حالانکہ ان کو بھی متساہل لکھ چکے ہیں (دیکھو ص ۷٦) علاوہ بریں حاکم کی تصحیح کے لیے مستدرک ج ۲ ص ۲۰۰ کا حوالہ دینا بھی غلط بیانی ہے، اس لیے کہ مطبوعہ مستدرک ج ۲ ص ۲۰۰ حاکم نے ہرگز تصحیح نہیں کی ہے۔

۳- ابوداؤد کی تصحیح کا حوالہ بھی دیا ہے، حالانکہ ابوداؤد نے تصحیح نہیں کی ہے، مجیب سچے ہوں تو

ان کی عبارت نقل کریں، اور اگر مجیب یہ فرمائیں کہ ابوداؤد نے صراحۃً تو تصحیح نہیں کی ہے، لیکن سکوت کیا ہے اور ان کا سکوت دلیل صحت ہے، تو اولاً اس کو مجیب کے اکابر نے اس اطلاق کے ساتھ غلط قرار دیا ہے۔

ثانیاً: - مجیب نے ص ۸۳ میں لکھا ہے کہ ''اصحاب سنن (ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ) نے صحت کا التزام تو کیا نہیں، پس ان کے ذکر کا درمیان میں لانا بے کار ہے'' اب مجیب ہی بتائیں کہ ان کی یہ بات صحیح ہے یا وہ، اور اس سے ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ مجیب نے جتنے قاعدے قانون لکھے ہیں وہ سب اپنے مطلب کے لیے ہیں، غور تو کیجیے ایسی متضاد باتیں کوئی صاحب فہم انسان لکھ سکتا ہے؟

علاوہ بریں اس صورت میں یہی لکھنا چاہئے کہ ابوداؤد نے سکوت کیا ہے، سکوت کے بجائے تصحیح کا لفظ اگر میں نے لکھا ہوتا تو مجیب اس کو فوراً غلط بیانی قرار دے دیتے۔

۴- بیہقی کا نام لکھ کر بذل المجہود ص ۹۰ کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ وہاں پر بیہقی کی تصحیح کا کوئی ذکر بذل المجہود میں نہیں ہے، مجیب صاحب کی یہ جرأت ان کی جماعت میں اچھی نظر سے نہ دیکھی جائے گی کہ بیہقی کا نام اور بذل المجہود کا حوالہ انھوں نے بالکل جھوٹ موٹ لکھ دیا۔

۵- مولانا خلیل احمد صاحب کا نام لکھ کر بھی مذکورہ بالا حوالہ دیا ہے، یہاں بھی دو غلط بیانیاں ہیں: ایک تو اس سلسلہ میں مولانا کو شمار کرنا، دوسرے اس کے لیے مذکورہ بالا حوالہ دینا۔ اگر مجیب صاحب سچے ہوں تو بذل المجہود ص ۹۰ کی وہ عبارت نقل کریں جس میں بیہقی کی تصحیح مذکور ہے اور وہ بھی جس سے مولانا کی تصحیح یا تحسین ثابت ہوتی ہے۔

۶- امام بخاری کا نام لکھ کر جوہر نقی ج ۲ ص ۹۰ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کی نسبت سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اگر جوہر نقی کا حوالہ دینے سے یہ مقصود ہے کہ صاحبِ جوہر نے بخاری کا قول بے رد وکد نقل کیا ہے تو اس میں دو جھوٹ ہیں: ایک یہ کہ صاحب جوہر نے بخاری کا بذات خود قول نقل ہی نہیں کیا ہے، بلکہ صاف صاف یہ لکھا ہے کہ اس کو بیہقی نے نقل کیا ہے، دوسرے صاحب جوہر نے اس پر کلام بھی کر دیا ہے، پس جس قول کو بیہقی نے نقل کیا تھا اس کو صاحب جوہر نے نقل کر کے رد کر دیا تو اس سے ہم پر کیا حجت قائم ہوسکتی ہے، مجیب صاحب میرے بجائے خود اپنے کو یہ سمجھائیں تو بہتر ہوگا کہ ''تالیف وتصنیف میں اس قسم کے داؤ پیچ مفید نہیں ہوتے (آثار ص ۶۳)''

دوسری بات یہ ہے کہ بیہقی نے بخاری کا جو قول نقل کیا ہے اس کو مجیب نے نقل نہیں کیا ورنہ ان کی فریب کاری اچھی طرح کھل جاتی، بات یہ ہے کہ بخاری [نے] مسند والی سند کی تصحیح نہیں ہے، بلکہ اس سند سے جو حدیث ابوالعاص کے قصہ کی مروی ہے اس کو ایک دوسری حدیث سے اصح کہا ہے، اور آثار ص ۵۲ میں اصح کا مطلب یہ بھی لکھا ہے کہ ''دو ضعیف حدیثوں میں سے ایک دوسری کے اعتبار سے اصح ہے نہ یہ کہ حقیقت میں صحیح ہے جیسے دو کمزور آدمیوں میں سے ایک میں دوسرے کے اعتبار سے زیادہ قوت ہوتی ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ بہت مضبوط ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ حقیقت میں یہ بہت قوی ہے بلکہ اعتباری قوت مراد ہوتی ہے حقیقت میں تو دونوں ہی کمزور ہیں''۔

(انتہی بلفظہ ص ۵۲-۵۳)

اس کو پڑھ کر مجیب کی دیانت داری کی جتنی چاہئے داد دیتے چلے جائیے۔ ہماری باری آئی ہے تو اصح کہنے سے تصحیح لازم نہیں آتی اور اپنی باری پر تصحیح لازم آنے لگتی ہے یہ عجیب اندھیر ہے؟

۷- حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی العرف الشذی کے حوالہ کے ساتھ لیا گیا ہے، لیکن اولاً تو یہ کتاب حضرت موصوف کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ آپ کے درس کی تقریر ہے جس کو ایک صاحب نے اپنی فہم وحفظ کی بنا پر جمع کر دیا ہے، جس پر اعتماد کرنا مشکل ہے۔

ثانیاً:- العرف الشذی میں اس سند کی تصحیح یا تحسین نہیں ہے، بلکہ اس سند سے کئی ایک روایت آئی ہے، اس کی تصحیح باعتبار اس کے مضمون کے کی گئی ہے، مجیب صاحب العرف الشذی کی وہ عبارت پوری مع ترجمہ نقل کر دیں بس فیصلہ ہو جائے گا۔

۸:- ذہبی کی تصحیح کا حال اس رسالہ کے ص میں ملاحظہ کیجئے۔

۹و۱۰:- ابن حجر وعینی کی تحسین کا جواب اس رسالہ کے ص میں پڑھئے۔

۱۱:- ابویعلی کی تصحیح میں تو بحث ہی ہو رہی ہے، لہذا ان کا نام لینا مصادرہ عن المطلوب کے قبیل سے ہے، مجیب مناظرہ کے فن سے بالکل نا آشنا ہیں۔

۱۲:- امام احمد نے بھی ابوالعاص کے واقعہ والی حدیث کی تصحیح ان کے واقعہ کی دوسری حدیث کے مقابلہ میں کی ہے اور اس تصحیح میں بھی اسناد کی صحت کی تصریح [۱] نہیں کی ہے، (دیکھو اعلام الموقعین

---

(۱) بلکہ اعلام ج ۱ ص ۲۸۵ میں امام احمد کا جو قول نقل کیا ہے وہ تو متن کی تصحیح میں صریح ہے ملاحظہ ہو والصحیح انہ اقرھما علی النکاح الاول پس تصحیح اسناد کے سلسلہ میں امام احمد کا نام لینا غلط بیانی ہے ۱۲ منہ

ج۲ص۲۵) پس امام احمد کے اس قول کا بھی وہی مطلب ہے جو امام بخاری کے قول کا ہے، یعنی یہ کہ ابوالعاص کے واقعہ کی ایک حدیث دوسری سے نسبۃً بہتر ہے، جس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فی نفسہ بھی وہ صحیح ہے۔ اگر مجیب اس کے خلاف کے مدعی ہوں تو امام احمد کی پوری عبارت نقل کر کے اپنا مدعا ثابت کریں اس کے بعد میں ناظرین پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجیب نے جن محدثین کے نام لکھے ہیں انھوں نے مسند احمد والی حدیث کو نہ صحیح کہا ہے نہ حسن، بلکہ مسند کی سند سے ایک اور حدیث ایک دوسرے مسئلہ میں ان الفاظ کے ساتھ **رد رسول اللّٰہ ابنتہ علی أبی العاص بالنکاح بعد سنتین** وارد ہوئی ہے، اس کی تصحیح و تحسین کی نسبت مجیب نے یہ سب نام ذکر کیے ہیں، اور اس میں بھی غلط بیانیوں سے کام لیا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس کی بھی اجلہ محدثین [نے] تضعیف ہی کی ہے، چند کے نام ملاحظہ ہوں۔

۱:- عبدالحق ازدی (جوہر ص۹۰ زیلعی ص۶۴)

۲:- امام خطابی (جوہر ص۹۰ نیل ج۶ ص فتح ج۹ ص)

۳:- ذہبی نے اس کو داؤد کے مناکیر میں شمار کیا ہے (میزان)

۴:- ابن عبدالبر نے اس کو متروک کہا ہے (جوہر ص۹، نیل ج۶ ص، فتح ج۹ ص)

۵:- امام ترمذی نے اس میں وہم ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے (ترمذی ص)

۶:- ابن المدینی نے ہر اس حدیث کو جس کو داؤد عکرمہ سے روایت کریں منکر کہا ہے اور یہ حدیث اس سند سے مروی ہے، پس ان کے نزدیک یہ منکر ہے۔

۷:- ابوداؤد کا بھی یہی قول ہے۔

۸:- علامہ ابن الترکمانی کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔

(جاری ہے)

سعودیہ کی مجلس کبار علماء کا فیصلہ کہ تین طلاق دینے سے تین ہی طلاق پڑتی ہے

ترجمہ وتلخیص: مولانا نسیم اللہ اعظمی

مخالفین (۱) کا نقطۂ نظر

[مجلة البحوث الإسلامية سعودی عرب کا ایک موقر اور معیاری سہ ماہی علمی وتحقیقی رسالہ ہے، جو ۱۳۹۷ھ = ۱۹۷۷ء سے مسلسل شائع ہوتا چلا آ رہا ہے، اور بڑے علمی وقیمتی مضامین اس کے صفحات کی زینت بنتے ہیں، اس مجلّہ کے جلد اول کے تیسرے شمارے میں حکم الطلاق الثلاث بلفظ واحد کے عنوان سے ایک طویل بحث شائع ہوئی تھی، جس میں موضوع کے تمام پہلوؤں اور فقہاء کے اقوال ونظریات کا جائزہ لے کر یہ قرارداد پیش کی گئی تھی، کہ ایک مجلس میں تین طلاق دیدی جائے تو وہ واقع ہوجاتی ہے۔ حضرت محدث الاعظمی رحمہ اللہ نے اسی وقت مدرسہ مرقاۃ العلوم کے اس وقت کے استاذ حضرت مولانا نسیم اللہ صاحب اعظمی سے ترجمہ اور تلخیص کرائی، پھر مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مدرسہ مرقاۃ العلوم سے یہ ترجمہ وتلخیص رسالہ کی شکل میں شائع ہوئی، موجودہ حالات میں مناسب معلوم ہوا کہ اس رسالے کو قارئین المآثر کی خدمت میں پیش کردیا جائے، جو وقت کی بڑی ضرورت ہے، ادارہ]

مخالفین کی رائے میں بیک لفظ تین طلاق دینے سے ایک واقع ہوتی ہے، صحیح روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہی قول مروی ہے، اور صحابہ کرام میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، ابن عوف رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور تابعین میں عکرمہ وطاؤس وغیرہ نے اسی پر فتویٰ دیا ہے [۲] اور ان

(۱) ''مخالفین'' کا لفظ اصل قرارداد میں موجود ہے چونکہ انھوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے اس لیے مخالفین کا عنوان اختیار کیا گیا۔

(۲) علامہ ابن القیم نے اغاثۃ اللہفان میں نہایت صفائی کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سوا اور کسی صحابی سے اس قول کی نقل صحیح ہم کو معلوم نہیں ہوئی ۱۲ (اغاثہ ۱۷۹/) بحوالہ اعلام مرفوعہ ۳۰/

کے بعد محمد بن اسحاق، فلاس، حارث عکلی، ابن تیمیہ، ابن قیم وغیرہ نے بھی اس کے موافق فتویٰ دیا ہے۔ان کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔

﴿۱﴾

الطلاق مرتان فإمساک بمعروف أو تسریح بإحسان (البقرة/۲۲۹)

طلاق دو مرتبہ ہے، پھر خواہ رکھ لینا قاعدہ کے موافق خواہ چھوڑ دینا خوش عنوانی کے ساتھ۔

آیت کی توضیح یہ ہے کہ مشروع طلاق جس میں شوہر کا اختیار باقی رہتا ہے چاہے تو بیوی سے رجعت کرلے یا بلا رجعت اسے چھوڑ دے یہاں تک کہ عدت پوری ہوجائے اور بیوی شوہر سے جدا ہوجائے وہ دوبار ہے۔''مرتان کا معنی مرةً بعد مرةٍ'' ہے، خواہ ہر مرتبہ ایک طلاق دے یا بیک لفظ تین طلاق دے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ''دو مرتبہ'' کہا ہے ''دو طلاق'' نہیں کہا ہے، اس کے بعد اگلی آیت میں فرمایا:

فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره (البقرة/ ۲۳۰)

پھر اگر طلاق دیدے عورت کو تو پھر وہ اس کے لیے حلال نہ رہے گی اس کے بعد یہاں تک کہ وہ اس کے سوا ایک اور خاوند کے ساتھ نکاح کرلے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تیسری مرتبہ بیوی کو طلاق دینے سے وہ حرام ہوجاتی ہے، خواہ تیسری مرتبہ ایک طلاق دی ہو یا بیک لفظ تین طلاق دی ہو۔اس تقریر سے معلوم ہوا کہ متفرق طور پر تین مرتبہ طلاق دینے کی مشروعیت ہوئی ہے، لہذا ایک مرتبہ میں تین طلاق دینا ایک کہلائے گا اور وہ ایک سمجھا جائے گا۔

﴿۲﴾

مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں بطریق طاؤس ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

کان الطلاق الثلٰث علی عهد رسول اللّٰه ﷺ وأبی بکر وسنتین من خلافة عمر طلاق الثلٰث واحدة فقال عمر رضی اللّٰه عنه :ان الناس قد

رسول اللہ ﷺ کے عہد اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت اور عہد فاروقی کے ابتدائی دوسال میں تین طلاق ایک ہوتی تھی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا،لوگوں نے ایک ایسے معاملہ

استعجلوا في أمر كانت لهم فيه أناة فلو أمضيناه عليهم فأمضاه عليهم. میں جس میں مہلت تھی عجلت سے کام لینا شروع کردیا ہے، اگر ہم اسے یعنی تین طلاق کو نافذ کردیتے تو اچھا ہوتا پس اسے نافذ کردیا۔

مسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ ''ابوالصہباء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا آپ کو معلوم نہیں کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی اور عہد فاروقی کے ابتدا میں تین طلاق ایک تھی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں، لیکن جب لوگوں نے بکثرت طلاق دینا شروع کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تینوں کو نافذ کردیا''۔

یہ حدیث بیک لفظ تین طلاق کے ایک ہونے پر وضاحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے اور یہ حدیث منسوخ نہیں ہے، کیونکہ عہد صدیقی اور عہد فاروقی کے ابتدائی دو سال میں اس حدیث پر برابر عمل جاری رہا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین طلاق نافذ کرنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ لوگوں نے اس میں عجلت سے کام لینا شروع کردیا ہے، انھوں نے نسخ کا دعویٰ نہیں کیا، نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین طلاق نافذ کرنے میں صحابہ کرام سے مشورہ لیا اور کسی ایسی حدیث کے چھوڑنے میں جس کا نسخ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہو صحابہ کرام سے مشورہ نہیں کرتے۔

مخالفین کہتے ہیں کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کے جو جوابات دیئے گئے ہیں وہ یا تو پر تکلف تاویل ہے یا بلا دلیل لفظ کو خلاف ظاہر پر حمل کرنا ہے یا شذوذ و اضطراب اور طاؤس کے ضعیف ہونے کا طعن ہے، لیکن مسلم نے جب اس حدیث کو اپنی صحیح میں روایت کیا ہے تو یہ طعن نا قابل تسلیم ہے، مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ اپنی کتاب میں صرف صحیح حدیث ہی روایت کریں گے، اور پھر اس حدیث کو مطعون کرنے والے اسی حدیث کے آخری حصہ ''**فقال عمر إن الناس قد استعجلوا في أمر كانت لهم فيه أناة الخ** '' کو اپنے قول کی حجت بناتے ہیں اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حدیث کا آخری حصہ قابل قبول حجت ہو اور اس کا ابتدائی حصہ اضطراب اور راوی کے ضعف کی وجہ سے نا قابل حجت ہو اور اس سے بھی زیادہ بعید بات یہ ہے کہ عہد نبوی میں تین طلاق کے ایک ہونے پر عمل جاری رہا ہو، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع نہ رہی ہو جب کہ قرآن نازل ہورہا تھا، ابھی وحی کا سلسلہ برابر جاری تھا اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے حضرت عمر کے زمانے تک

پوری امت ایک خطا پر عمل کرتی رہی ہو۔ انھیں پھسپھسی باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کو ان کی حدیث کا معارض ٹھہرایا جائے، علماء حدیث اور جمہور فقہاء کے نزدیک بشرط صحت راوی کی روایت ہی کا اعتبار ہوتا ہے، اس کے خلاف اس کی رائے یا فتویٰ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ یہ قاعدہ ان لوگوں کا بھی ہے جو ایک لفظ کی تین طلاق سے تین نافذ کرتے ہیں، لوگوں نے عہد فاروقی میں ایک لفظ کی تین طلاق سے تین نافذ ہونے پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے اور حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کو اس اجماع کا معارض ٹھہرایا ہے، حالانکہ انھیں معلوم ہے کہ اس مسئلہ میں سلف سے خلف تک اور آج تک اختلاف چلا آرہا ہے۔ حدیث زوجۂ رفاعہ قرظی سے بھی استدلال درست نہیں، اس لیے کہ صحیح مسلم میں ثابت ہے کہ انھوں نے اپنی بیوی کو تین طلاقوں میں سے آخری طلاق دی تھی اور رفاعہ نضری کا اپنی بیوی کے ساتھ اس جیسا واقعہ ثابت نہیں کہ واقعات متعدد مانے جائیں، اور ابن حجر نے تعدد واقعہ کا فیصلہ نہیں کیا ہے، انھوں نے یہ کہا ہے کہ اگر رفاعہ نضری کی حدیث محفوظ ہوگی تو دونوں حدیثوں سے واضح ہوتا ہے کہ واقعہ متعدد ہے ورنہ ابن حجر نے اصابہ میں کہا ہے'' ....لیکن مشکل یہ ہے کہ دونوں واقعہ میں دوسرے شوہر کا نام عبدالرحمٰن بن الزبیر متحد ہے''۔

﴿۳﴾

امام احمد نے اپنی مسند میں بطریق عکرمہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

قال: طلق ركانة بن عبد يزيد اخو بني المطلب امرأته ثلاثاً في مجلس واحد فحزن عليها حزناً شديداً، قال فسأله رسول الله ﷺ كيف طلَّقتها؟ قال: طلقتها ثلاثاً قال فقال في مجلس واحدٍ، قال: نعم، فقال فإنما تلك واحدة فارجعها إن شئت، قال: فراجعها.	رکانہ بن عبد یزید نے اپنی عورت کو ایک مجلس میں تین طلاق دی پھر اس پر بہت غمگین ہوئے، حضور ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا، تم نے کیسی طلاق دی ہے؟ کہا کہ تین طلاق دی ہے، پوچھا کہ ایک مجلس میں؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ صرف ایک طلاق ہوئی اگر چاہو تو رجعت کر سکتے ہو، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انھوں نے اپنی بیوی سے رجعت بھی کر لیا تھا۔

ابن قیم نے اعلام الموقعین میں کہا ہے کہ امام احمد اس حدیث کے سند کی تصحیح و تحسین کرتے

تھے [1]۔ اور جو یہ مروی ہے کہ رکانہ نے لفظ ''بتۃ'' سے طلاق دی تھی اسے احمد رحمۃ اللہ علیہ، بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ابوعبید نے ضعیف قرار دیا ہے [2]۔

﴿۴﴾

ابن تیمیہ، ابن قیم وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اور خلافت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دو سال میں ایک لفظ کی تین طلاق سے ایک ہی سمجھا جاتا رہا اور جو فتاویٰ صحابہ کرام سے اس کے خلاف مروی ہیں وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تین طلاق نافذ کرنے کے بعد کے ہیں، تین طلاق نافذ کرنے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارادہ نہیں تھا کہ اسے ایک مستقل قاعدہ بنا ڈالیں جو ہمیشہ مستمر رہے، ان کا ارادہ تو یہ تھا کہ جب تک دواعی واسباب موجود ہیں تین طلاق کو نافذ قرار دیا جائے جیسا کہ تغیرِ حالات سے بدلنے والے فتاویٰ کا حال ہوتا ہے، اور امام کو اس وقت رعایا کی تعزیر کا حق بھی ہے جس وقت ایسے معاملات میں جن کے کرنے اور چھوڑنے کا ان کو اختیار ہو، سوءتصرف پیدا ہو جائے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سزا کے طور پر غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے والے تین صحابہ کو ایک وقت تک اپنی بیویوں سے جدا رہنے کا حکم دے دیا تھا باوجودیکہ ان کی بیویوں سے کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی یا جیسے شراب نوشی کی سزا میں زیادتی، یا تاجروں کی ناجائز نفع اندوزی کے وقت قیمتوں کی تعیین، یا جان ومال کی حفاظت کے لیے لوگوں کو خطرناک راستوں پر جانے سے روکنا باجودیکہ ان راستوں پر ہر ایک کو سفر کرنا مباح رہا ہو۔

﴿۵﴾

پانچویں دلیل یہ ہے کہ تین طلاق کو لعان کی شہادتوں پر قیاس کیا جائے [3] اگر شوہر کہے کہ

(۱) حافظ ابن حجر نے تلخیص میں اس حدیث کو ذکر کر کے فرمایا ہے وھو معلول ایضاً یعنی مسند احمد والی حدیث بھی بہت مجروح وضعیف ہے (ص ۳۱۹) اور حافظ ذہبی نے بھی اس کو داؤد بن الحصین کے مناکیر میں شمار کیا ہے، پس اس حالت میں اگر اس کی اسناد حسن یا صحیح بھی ہو تو استدلال نہیں ہوسکتا اس لیے کہ اسناد کی صحت استدلال کی صحت کو مستلزم نہیں۔ (اعلام مرفوعہ/۲۵)

(۲) امام شافعی، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم اور دارقطنی وغیرہ نے حضرت رکانہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے اپنی بی بی کو لفظ ''بتۃ'' کے ساتھ طلاق دی .... حافظ ابن حجر نے تلخیص/۳۱۹ میں لکھا ہے کہ (صحہ ابوداؤد وابن حبان والحاکم) یعنی اس حدیث کو ابوداؤد اور ابن حبان اور حاکم نے صحیح کہا ہے، ابن ماجہ/ ۱۴۹ میں ہے کہ میں نے اپنے استاذ طنافسی کو یہ فرماتے ہوئے سنا ''مااشرف ھذا الحدیث'' یہ حدیث کتنی شریف و بہتر ہے۔ (اعلام مرفوعہ/۱۱۔ العلامۃ المحدث الاعظمی)

(۳) شیخ شنقیطی نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ قیاس مع الفارق ہے اس لیے کہ شوہر اگر لعان کی صرف ایک ہی شہادت پر اکتفا کر لے تو وہ کالعدم قرار دے دی جاتی ہے جب کہ ایک طلاق کالعدم نہیں قرار دی جاتی، وہ بھی نافذ ہو جاتی ہے۔۱۲
(اضواء البیان ۱/ ۱۹۵ بحوالہ مجلّہ البحوث)

میں اللہ کی چار شہادت دیتا ہوں کہ میں نے اپنی عورت کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے تو اسے ایک ہی شہادت سمجھا جاتا ہے، لہٰذا جب اپنی بیوی سے ایک مرتبہ میں کہے کہ میں تمہیں تین طلاق دیتا ہوں تو اسے ایک ہی طلاق سمجھا جائے گا اور اگر اقرار کا تکرار کیے بغیر کہے کہ میں زنا کا چار مرتبہ اقرار کرتا ہوں تو اسے ایک ہی اقرار سمجھا جاتا ہے، یہی حال طلاق کا بھی ہے اور ہر وہ بات جس میں قول کا تکرار معتبر ہے محض عدد ذکر کر دینا کافی نہ ہوگا، مثلاً فرض نمازوں کے بعد تسبیح وتحمید وغیرہ۔

جمہور کا مسلک

بیک لفظ تین طلاق دینے سے تینوں واقع ہو جائیں گی، یہ جمہور صحابہ وتابعین اور تمام ائمہ مجتہدین کا مسلک ہے اور اس پر انھوں نے کتاب وسنت اور اجماع وقیاس سے دلائل قائم کیے ہیں، ان میں سے اہم دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱)

یا أیھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن ط وأحصوا العدۃ واتقوا اللّٰہ ربکم لا تخرجوھن من بیوتھن ولایخرجن الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ وتلک حدود اللّٰہ ومن یتعد حدود اللّٰہ فقد ظلم نفسہ لا تدری لعل اللّٰہ یحدث بعد ذٰلک امراً.
(طلاق/ ۱،۲)

اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو ان کی عدت پر طلاق دو اور عدت گنتے رہو اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے، ان کو ان کے گھروں سے مت نکالو اور وہ بھی نہ نکلیں مگر جو صریح بے حیائی کریں، اور یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے بڑھے تو اس نے اپنا برا کیا اس کو خبر نہیں کہ شاید اللہ اس طلاق کے بعد نئی صورت پیدا کر دے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے وہ طلاق مشروع کی ہے جس کے بعد عدت شروع ہو، تاکہ طلاق دینے والا بااختیار ہو، چاہے تو عمدہ طریقہ سے بیوی کو رکھ لے یا خوبصورتی کے ساتھ چھوڑ دے اور یہ اختیار اگر چہ ایک لفظ میں رجعت سے پہلے تین طلاق جمع کر دینے سے نہیں حاصل ہوسکتا، لیکن آیت کے ضمن میں دلیل موجود ہے کہ یہ طلاق بھی واقع ہو جائے گی۔ اگر واقع نہ ہوتی تو وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والا نہ کہلاتا اور نہ اس کے سامنے دروازہ بند ہوتا جیسا کہ اس آیت میں

اشارہ ہے **ومن یتق اللّٰہ یجعل له مخرجا.**

مخرج کی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے رجعت کی ہے، ایک سائل کے جواب میں جس نے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی تھی، آپ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "**من یتق اللّٰہ یجعل له مخرجا**" اور تم نے اللہ سے خوف نہیں کیا، لہٰذا میں تمہارے لیے کوئی خلاصی کی راہ نہیں پاتا ہوں، تم نے اللہ کی نافرمانی کی اور تم سے تمہاری بیوی جدا ہوگئی۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو شخص اپنی عورت کو تین طلاق دے دے وہ خود پر ظلم کرنے والا ہے، اب اگر یہ کہا جائے کہ تین طلاق سے ایک ہی واقع ہوتی ہے تو اس کو اللہ سے ڈرنا نہیں کہا جاسکتا، جس کا حکم "من یتق اللہ الخ" میں دیا گیا ہے اور جس کا التزام کرنے سے خلاصی کی سبیل پیدا ہوتی اور نہ یہ ظالم کی سزا بن سکتی ہے جو حدود اللہ سے تجاوز کرنے والا ہے، تو گویا شارع نے ایک منکر بات کہنے والے پر اس کا اثر مرتب نہیں کیا جو اس کے لیے عقوبت بنتا، جیسا کہ بیوی سے ظہار کرنے والے پر بطور عقوبت کفارہ لازم ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تینوں طلاق نافذ کرکے طلاق دینے والے کو سزا دی ہے اور اس کے سامنے راستہ مسدود کردیا ہے، اس لیے کہ اس نے اللہ سے خوف نہیں کیا، خود پر ظلم کیا اور اللہ کی حدود سے تجاوز کیا۔

﴿۲﴾

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

أن رجلا طلق امرأته ثلاثاً فتزوجت فطلقت فسئل النبي صلی اللہ علیہ وسلم أتحل للأول؟ قال: لا حتیٰ یذوق عسیلتها کما ذاق الأول

ایک شخص نے اپنی بی بی کو تین طلاقیں دے دیں اس نے دوسرے سے نکاح کرلیا، دوسرے شوہر نے قبل خلوت کے طلاق دے دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اب پہلے کے لیے حلال ہوگئی یا نہیں؟ فرمایا کہ نہیں تاوقتیکہ دوسرا شوہر پہلے کی طرح لطف اندوز صحبت نہ ہو پہلے کے لیے حلال نہیں ہوسکتی۔

بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث "**باب من اجاز الطلاق ثلاثاً**" کے تحت ذکر کیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے بھی اس سے یکجا تین طلاق ہی سمجھا ہے، لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے

کہ یہ رفاعہ قرظی کے واقعہ کا مختصر ہے جس کی بعض روایات میں آیا ہے کہ انھوں نے تین طلاقوں میں کی آخری طلاق دی، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اعتراض کو اس طرح رد کیا ہے کہ رفاعہ قرظی کے علاوہ بھی ایک صحابی کا ایسا ہی واقعہ اپنی بیوی کے ساتھ پیش آیا ہے اور دونوں ہی عورتوں سے عبدالرحمٰن بن الزبیر نے نکاح کیا تھا اور صحبت سے پہلے ہی طلاق دے دی تھی، لہٰذا رفاعہ قرظی کے واقعہ پر اس حدیث کو محمول کرنا بے دلیل ہے، اس کے بعد حافظ ابن حجر نے کہا کہ اس سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوگئی جو دونوں واقعہ کو ایک کہتے ہیں۔

جب حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کا حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ تقابل کیا جائے تو دو حال پیدا ہوتے ہیں، یا تو دونوں حضرات کی حدیث میں تین طلاق مجموعی طور پر مراد ہے یا متفرق طور پر، اگر تین طلاق یکجائی مراد ہے تو حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا متفق علیہ ہونے کی وجہ سے اولیٰ ہے، اور اِس حدیث میں تصریح ہے کہ وہ عورت تین طلاق کی وجہ سے حرام ہوگئی تھی اور اب شوہر ثانی سے وطی کے بعد شوہر اول کے لیے حلال ہوسکتی ہے، اور اگر متفرق طور پر مراد ہے تو حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہ میں یکجائی تین طلاقوں کے واقع نہ ہونے پر استدلال صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ دعویٰ تو یہ ہے کہ ایک لفظ کی تین طلاق سے ایک طلاق پڑتی ہے اور حدیثِ ابن عباس میں متفرق طلاقوں کا ذکر ہے، اور یہ کہنا کہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں تین طلاق متفرق اور حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہ میں مجموعی طور پر مراد ہے بلا وجہ ہے، اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے[1]۔

---

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث کے علاوہ بھی بہت سی احادیث ہیں جو یکجائی تین طلاق کے نافذ ہونے پر دلالت کرتی ہیں، ان میں سے

۱- حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ابن ابی شیبہ، بیہقی، دارقطنی نے ذکر کی ہے۔
۲- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث دارقطنی نے ذکر کی ہے۔
۳- حضرت معاذ بن جبل کی حدیث بھی دارقطنی نے روایت کی ہے۔
۴- حضرت حسن بن علی کی حدیث بھی دارقطنی نے روایت کی ہے۔
۵- عامر شعبی سے فاطمہ بن قیس کے واقعۂ طلاق کی حدیث ابن ماجہ نے روایت کی ہے۔
۶- حضرت عبادہ بن الصامت کی ایک حدیث دارقطنی و مصنف عبدالرزاق میں مذکور ہے۔

ان تمام احادیث سے تین طلاق کا لازم ہونا مفہوم ہوتا ہے، تفصیل کے لیے دیکھئے حضرت الاستاذ محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی صاحب کا رسالہ اعلام مرفوعہ ۴ تا ۱۷

﴿۳﴾

بعض فقہاء مثلاً ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ نکاح ایک مِلک ہے، جیسے متفرق طور پر زائل کیا جاسکتا ہے تو مجموعی طور پر بھی زائل کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ تمام ملکیتوں کا یہی حکم ہے، قرطبی نے کہا ہے کہ جمہور کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر شوہر نے بیوی کو تین طلاق دی تو بیوی اس کے لیے اسی وقت حلال ہوسکتی ہے جب کسی دوسرے شوہر سے ہم صحبت ہولے، اس میں لغۃً اور شرعاً شوہر اول کے تین طلاق مجموعی یا متفرق طور پر دینے میں کوئی فرق نہیں ہے، فرق محض صورۃً ہے جس کو شارع نے لغو قرار دیا ہے، اس لیے کہ شارع نے عتق، اقرار اور نکاح کو جمع وتفریق کی صورت میں یکساں رکھا ہے، مولیٰ اگر بیک لفظ کہے کہ میں نے ان تینوں عورتوں کا نکاح تم سے کردیا تو نکاح منعقد ہوجاتا ہے، جیسے الگ الگ یوں کہے کہ اس کا اور اس کا نکاح تم سے کردیا تو نکاح منعقد ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اگر کہے کہ میں نے ان تینوں غلاموں کو آزاد کردیا تو سب کی آزادی نافذ ہوجائے گی جیسے الگ الگ یوں کہے کہ میں نے اس کو اور اس کو اور اس کو آزاد کیا تو سب کی آزادی نافذ ہوجاتی ہے، یہی حال اقرار کا بھی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جمع وتفریق میں کوئی فرق نہیں، زیادہ سے زیادہ یکجائی تین طلاق دینے والے کو اپنا اختیار ضائع کرنے میں انتہا پسندی پر ملامت کا مستحق ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

﴿۴﴾

بعض مخالفین کے علاوہ تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ ہازل کی طلاق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کی اس حدیث کی وجہ سے واقع ہوجاتی ہے جسے تمام امت نے قبول کیا ہے۔

ثلاث جدھن جد وھزلھن جد	تین چیزیں ہیں جن کا واقعی بھی حقیقت ہے اور
الطلاق والنکاح والرجعۃ	مذاق بھی حقیقت ہے، طلاق، نکاح، رجعت

مذاق میں طلاق دینے والے کا دل بھی قصد وارادہ کے ساتھ طلاق کا ذکر کرتا ہے، لہٰذا جو طلاق ایک سے زائد ہوگی وہ مسمائے طلاق سے خارج نہیں ہوگی، بلکہ وہ بھی صریح طلاق ہوگی اور تین کو ایک سمجھنا گویا بعض عدد کو زیر عمل لاکر باقی کو چھوڑ دینا ہے، لہٰذا یہ جائز نہ ہوگا۔

﴿۵﴾

یکجائی تین طلاق دینے سے تین واقع ہونا اکثر اہلِ علم کا قول ہے، اسی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ،

عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابن عمر رضی اللہ عنہ، ابن عمرو رضی اللہ عنہ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ اصحابِ رسول نے اختیار کیا ہے اور ائمہ اربعہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، مالک رحمۃ اللہ علیہ، شافعی رحمۃ اللہ علیہ، احمد رحمۃ اللہ علیہ، کے علاوہ دوسرے فقہاء مجتہدین ابن ابی لیلی رحمۃ اللہ علیہ، اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں، ابن عبدالہادی نے ابن رجب سے نقل کیا ہے کہ میرے علم میں کسی صحابی اور کسی تابعی اور جن ائمہ کے اقوال حلال وحرام کے فتویٰ میں معتبر ہیں ان میں سے کسی سے کوئی ایسی صریح بات ثابت نہیں جو بیک لفظ تین طلاق کے ایک ہونے پر دلالت کرے، خود ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے تین طلاق کے حکم میں مختلف اقوال پیش کرنے کے دوران کہا:

دوسرا مذہب یہ ہے کہ یہ طلاق حرام ہے اور لازم ونافذ ہے، یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد کا آخری قول ہے، ان کے اکثر تلامذہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور یہی مذہب سلفِ صحابہ وتابعین کی ایک بڑی تعداد سے منقول ہے۔

اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

''ایک لفظ کی تین طلاق کے بارے میں لوگوں کا چار مذہب ہے، پہلا مذہب یہ ہے کہ تین طلاق واقع ہوجاتی ہے، یہی مذہب ائمہ اربعہ جمہور تابعین اور بہت سے صحابۂ کرام کا ہے''۔

علامہ قرطبیؒ نے فرمایا:

''ہمارے علماء نے فرمایا کہ تمام ائمہ فتاویٰ ایک لفظ سے تین طلاق کے لازم ہونے پر متفق ہیں اور یہی جمہور سلف کا قول ہے''۔

ابن عربی نے اپنی کتاب الناسخ والمنسوخ میں کہا ہے اور اسے ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تہذیب السنن میں نقل کیا ہے:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے الطلاق مرتان (یعنی طلاق دومرتبہ ہے) آخر زمانہ میں ایک جماعت نے لغزش کھائی اور کہنے لگے ایک لفظ کی تین طلاق سے تین نافذ نہیں ہوتی، انھوں نے اس کو ایک بنادیا اور اس قول کو سلفِ اول کی طرف منسوب کردیا، علی رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، ابن عوف رضی اللہ عنہ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ، اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا اور حجاج بن ارطاۃ کی طرف روایت کی نسبت کردی جن کا مرتبہ ومقام کمزور اور مجروح ہے، اس سلسلہ میں ایک روایت کی گئی جس کی کوئی اصلیت نہیں''۔

انھوں نے یہاں تک کہا کہ:

''لوگوں نے اس سلسلہ میں جو احادیث صحابہ کی طرف منسوب کی ہیں وہ محض افتراء ہے، کسی

کتاب میں اس کی اصل نہیں اور نہ کسی سے اس کی روایت ثابت ہے'' اور آگے کہا:

''حجاج بن ارطاۃ کی حدیث نہ امت میں مقبول ہے اور نہ کسی امام کے نزدیک حجت ہے''

﴿۶﴾

حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے جوابات

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث پر کہ ''عہد نبوی، عہد صدیقی اور عہد فاروقی کے ابتدائی دو سال میں تین طلاق ایک تھی'' کئی اعتراضات وارد ہوتے ہیں جس کی بناء پر اس حدیث سے استدلال کمزور پڑ جاتا ہے۔

(الف) اس حدیث کے سند و متن میں اضطراب ہے، سند میں اضطراب یہ ہے کہ کبھی ''**عن طاؤس عن ابن عباس**'' کہا گیا، کبھی ''**عن طاؤس عن أبی الصهبا ء عن ابن عباس**'' اور کبھی ''**عن أبی الجوزاء عن ابن عباس**'' آیا ہے۔

متن میں اضطراب یہ ہے کہ ابو الصہباء نے کبھی ان الفاظ میں روایت کیا ہے:

ألم تعلم أن الرجل كان إذا طلق امرأته ثلاثاً قبل ان يدخل بها جعلوها واحدة. کیا آپ کو معلوم نہیں کہ مرد جب ملاقات سے پہلے اپنی بیوی کو تین طلاق دیتا تھا تو لوگ اسے ایک شمار کرتے تھے۔

اور کبھی ان الفاظ میں روایت کیا ہے:

ألم تعلم أن الطلاق الثلاث كان علىٰ عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وأبي بكر وصدر من خلافة عمر واحدة. کیا آپ کو معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور خلافت میں تین طلاق ایک تھی۔

(ب) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے میں طاؤس متفرد ہیں اور طاؤس میں کلام ہے، اس لیے کہ وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مناکیر روایت کرتے ہیں۔

قاضی اسماعیل نے اپنی کتاب احکام القرآن میں کہا ہے کہ طاؤس اپنے فضل و تقویٰ کے

باوجود منکر باتیں روایت کرتے ہیں اور انھیں میں سے یہ حدیث بھی ہے۔ ابن ایوب سے منقول ہے کہ وہ طاؤس کی کثرت خطاء پر تعجب کرتے تھے۔ ابن عبدالبر مالکی نے کہا کہ ''طاؤس اس حدیث میں تنہا ہیں''۔ ابن رجب نے کہا کہ ''علماء اہل مکہ طاؤس کے شاذ اقوال کا انکار کرتے تھے''۔ قرطبی نے ابن عبدالبر سے نقل کیا ہے کہ ''طاؤس کی روایت وہم اور غلط ہے، حجاز و شام اور مغرب کے کسی فقیہ نے اس پر اعتماد نہیں کیا ہے''۔

(ج) بعض اہل علم نے کہا ہے کہ حدیث دو وجہ سے شاذ ہے، ایک تو اس وجہ سے کہ اس کی روایت کرنے میں طاؤس متفرد ہیں اور کوئی ان کا متابع نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابن منصور کی روایت میں کہا ہے کہ ''ابن عباس کے تمام تلامذہ نے طاؤس کے خلاف روایت کیا ہے'' جوز جانی نے کہا کہ ''یہ حدیث شاذ ہے''۔ ابن عبدالہادی نے ابن رجب سے نقل کیا ہے کہ ''میں نے بڑی مدت تک اس حدیث کی تحقیق کا اہتمام کیا لیکن اس کی کوئی اصل نہ پا سکا''۔

شاذ ہونے کی دوسری وجہ وہ ہے جس کو بیہقی نے ذکر کیا ہے، انھوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے تین طلاق لازم ہونے کی روایات ذکر کرکے ابن المنذر سے نقل کیا کہ ''وہ ابن عباس کے بارے میں یہ گمان نہیں کرتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے کوئی بات محفوظ کی ہو اور پھر اس کے خلاف فتویٰ دیں''۔ ابن ترکمانی نے کہا کہ ''طاؤس کہتے تھے کہ ابوالصہباء مولیٰ ابن عباس نے ان سے تین طلاق کے بارے میں پوچھا تھا لیکن ابن عباس سے یہ روایت اس لیے صحیح نہیں مانی جاسکتی کہ ثقات خود انھیں سے اس کے خلاف روایت کرتے ہیں اور اگر صحیح بھی ہو تو ان کی بات ان سے زیادہ جاننے والے جلیل القدر صحابہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ابن عمر رضی اللہ عنہ، وغیرہم پر حجت نہیں ہوسکتی''۔

حدیث میں شذوذ ہی کی وجہ سے دو جلیل القدر محدثوں نے اس حدیث سے اعراض کیا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اثرم اور ابن منصور سے کہا کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث قصداً ترک کردی اس لیے کہ میری رائے میں اس حدیث سے یکجائی تین طلاق کے ایک ہونے پر استدلال درست نہیں، کیوں کہ حفاظِ حدیث نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کے خلاف روایت کیا ہے اور بیہقی نے امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے حدیث کو اسی وجہ سے قصداً چھوڑ دیا جس کی وجہ سے امام احمد نے

ترک کیا تھا اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ دوامامِ فن حدیث کو اسی وقت چھوڑ سکتے ہیں جب کہ چھوڑ نے کا سبب رہا ہو۔

(۵) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ایک اجتماعی حالت بیان کرتی ہے جس کا علم تمام معاصرین کو ہونا چاہئے تھا اور متعدد طرق سے اس کے نقل کے کافی اسباب ہونے چاہئیں تھے جس میں اختلاف کی گنجائش نہ ہوتی، حالانکہ اس حدیث کو ابن عباس سے بطریق آحاد ہی روایت کیا گیا ہے، اسے طاؤس کے علاوہ کسی نے روایت نہیں کیا ہے جب کہ وہ مناکیر بھی روایت کرتے ہیں، جمہور علماء اصول نے کہا ہے کہ اگر خبر آحاد کے نقل کے اسباب وافر ہوں تو محض کسی ایک شخص کا نقل کرنا اس کے عدم صحت کی دلیل ہے، صاحب جمع الجوامع نے خبر کے عدم صحت کے بیان میں اس خبر کو بھی داخل کیا ہے جو نقل کے اسباب وافر ہونے کے باوجود بطریق آحاد نقل کی گئی ہو، ابن حاجب نے مختصر الاصول میں کہا ہے ''جب تنہا کوئی شخص ایسی بات نقل کرے جس کے نقل کے اسباب کافی تھے، اس کے نقل میں ایک بڑی جماعت اس کے ساتھ شریک ہونی چاہئے تھی، مثلاً وہ تنہا بیان کرے کہ شہر کی جامع مسجد میں منبر پر خطبہ دینے کی حالت میں خطیب کو قتل کر دیا گیا، تو وہ جھوٹا ہے اس کی بات بالکل نہیں مانی جائے گی''۔ جس بات پر عہد نبوی، عہد صدیقی اور عہدِ فاروقی میں تمام مسلمان باقی رہے ہوں تو اس کے نقل کے کافی اسباب ہوں گے حالانکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی صحابی سے اس کے بارے میں ایک حرف بھی منقول نہیں (اور اس کو بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ابوالصہباء کے تلقین کرنے پر بیان کیا ہے) صحابہ کرام کی خاموشی دو بات پر دلالت کرتی ہے، یا تو حدیثِ ابن عباس میں تینوں طلاقیں بیک لفظ نہ مانی جائیں بلکہ اس کی صورت یہ ہے کہ بیک وقت تین الفاظ میں تین طلاق دی گئی اور لفظ کا تکرار تاکید پر محمول کیا جائے، یا یہ حدیث صحیح نہیں اس لیے کہ نقل کے کافی وسائل ہونے کے باوجود آحاد نے اسے روایت کیا ہے۔

(۵) جب ابن عباس رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ عہد نبوی، عہد صدیقی اور عہد فاروقی کے ابتدائی دور میں تین طلاق ایک سمجھی جاتی تھی تو ان کے صلاح وتقویٰ، علم واستقامت، اتباع سنت اور برملا حق گوئی کے پیش نظر یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ انھوں نے یکجائی تین طلاق سے تین نافذ کرنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کے حکم کی اتباع کی ہوگی۔تمتع حج، دو دینار کے عوض ایک دینار کی خرید وفروخت، ام ولد کی خرید وفروخت وغیرہ کے مسائل میں حضرت عمر سے ان کا اختلاف پوشیدہ نہیں، لہٰذا کسی ایسے مسئلہ میں وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت کیسے کرسکتے ہیں جس کے خلاف وہ خود روایت کرتے ہوں، تمتع حج کے بارے میں حضرت عمر سے ان کا جو اختلاف ہوا ہے اس سلسلہ میں ان کا یہ مشہور قول ان کی برملا حق گوئی کی واضح دلیل ہے، انھوں نے فرمایا کہ: ''قریب ہے کہ تم پر آسمان سے پتھر برسیں، میں کہتا ہوں رسول اللہ نے فرمایا اور تم لوگ کہتے ہو ابوبکر نے کہا، عمر نے کہا''۔

(و) اگر ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو قرون اولیٰ میں صحابۂ کرام کے صلاح وتقویٰ، علم واستقامت اور غایت اتباع کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے تین طلاقوں کو ایک جانتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم قبول کرلیا ہوگا، اس کے باوجود کسی سے بسند صحیح یہ ثابت نہیں کہ اس نے حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مطابق فتویٰ دیا ہو۔

(ز) مخالفین کا کہنا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین طلاق سے تین کے نفاذ کا حکم سزا کے طور پر جاری کیا تھا، اس لیے کہ ایسے کام میں جس پر بڑے غور وفکر کے بعد اقدام کرنا چاہئے تھا لوگوں نے عجلت سے کام لینا شروع کردیا تھا۔لیکن یہ بات تسلیم کرنا موجبِ اشکال ہے اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا متقی عالم وفقیہ کوئی ایسی سزا کیسے جاری کرسکتا ہے جس کے اثرات مستحق سزا تک ہی نہیں محدود رہتے، بلکہ دوسری طرف (یعنی بیوی کی طرف) بھی پہنچتے ہیں، حرام فرج کو حلال کرنا اور حلال فرج کو حرام کرنا اور حقوق رجعت وغیرہ کے مسائل اس پر مرتب ہوتے ہیں۔

مجلس کا فیصلہ

مجلسِ ہیئت کبار علماء نے جو فیصلہ کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

بعد دراسة المسئلة وتداول الرأى واستعراض الأقوال التى قيلت فيها ومناقشة ما على كل قول من إيراد توصل المجلس باكثريته الىٰ اختيار

مسئلہ موضوعہ کے مکمل مطالعہ، تبادلۂ خیال اور تمام اقوال کا جائزہ لینے اور ان پر وارد ہونے والے اعتراضات پر جرح ومناقشہ کے بعد مجلس نے اکثریت کے ساتھ ایک لفظ کی تین

القول بوقوع الطلاق الثلاث بلفظٍ واحدٍ ثلاثاً.
مجلة البحوث الإسلامية/ المجلد الأول / العدد الثالث/ ص ۱۶۵)

طلاق سے تین واقع ہونے کا قول اختیار کیا۔

لجنۂ دائمہ نے تین طلاق کے مسئلہ میں جو بحث تیار کی ہے اس کے اخیر میں مندرجہ ذیل اراکینِ مجلس کے دستخط بھی موجود ہیں۔

۱-ابراہیم بن محمد آل الشیخ	صدر لجنہ
۲-عبدالرزاق عفیفی	نائب صدر
۳-عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن غدیان	عضوِ مجلس
۴-عبداللہ بن سلیمان بن منیع	عضوِ مجلس

تنبیہ

اس مجلس کے جن علماء نے تین طلاق کو ایک قرار دیا ہے، انھوں نے صرف اس صورت کا یہ حکم بیان کیا ہے ''جب کوئی شخص یوں طلاق دے کہ میں نے تین طلاق دی (یا دیا)، لیکن جب کوئی یوں کہے کہ میں نے طلاق دیا۔ میں نے طلاق دیا۔ میں نے طلاق دیا۔ تو اس صورت میں وہ بھی نہیں کہتے کہ ایک طلاق پڑے گی'' (یعنی اس صورت میں ان کے نزدیک بھی تین طلاق واقع ہوگی)۔

اثنا عشری امامی شیعہ مذہب کے خدوخال

تحریر: سید محبّ الدین خطیب مصری　　ترجمہ: مسعود احمد الاعظمی

(دوسری قسط)

یہ خودساختہ قرآن جس کو شیعہ پوشیدہ طریقے سے ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں اور عقیدۂ تقیہ [1] پر عمل کرتے ہوئے اس کا اعلان نہیں کرتے ہیں اور وہ قرآن جو معلوم ہے اور مصحف عثمانی میں لکھا ہوا رائج ہے، دونوں کے درمیان موازنہ کرنے کے لیے حسین بن محمد تقی نوری طبرسی نے اپنی کتاب ''**فصل الخطاب في اثبات تحريف كتاب رب الأرباب**'' لکھی ہے، اور شیعہ عقیدۂ تقیہ پر عمل کرتے ہوئے نوری طبرسی کی کتاب سے براءت کا چاہے جتنا بھی اظہار کریں، مگر یہ کتاب ان کی معتبر کتابوں میں موجود ان کے علماء کی سیکڑوں عبارتوں پر مشتمل ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ تحریف کا پختہ عقیدہ اور اس پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں چاہتے کہ قرآن کے بارے میں ان کے اس عقیدے سے متعلق کوئی ہنگامہ کھڑا ہو۔ اس کے بعد یہ کہنا رہ جاتا ہے کہ قرآن دو ہیں، ایک تو عام ہے اور سب کو معلوم ہے، اور دوسرا خاص، پوشیدہ اور صیغۂ راز میں ہے، اور اسی پوشیدہ قرآن میں سے سورۂ ولایۃ ہے، اور انھوں نے اس کو اس بات سے جانا ہے جس کو گھڑ کر اپنے امام علی بن موسی رضا کی طرف منسوب کیا ہے کہ ''جس طرح تم نے سیکھا ہے اس طرح پڑھو، عنقریب وہ آئے گا جو تم کو سکھائے گا''۔

شیعوں کے خیالات میں ایک بات یہ بھی ہے کہ قرآن سے یہ آیت ''**وجعلنا علياً صهرك** (اور ہم نے علی کو آپ کا داماد بنایا) نکال دی گئی ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت سورۂ الم

---

(۱) شیعوں کے ہاں ''تقی'' نام بہت عام ہے، ان ہی میں سے **فصل الخطاب في تحريف كتاب رب الأرباب** کے والد بھی ہیں، یہ نام ان کے ہاں ''تقیہ'' سے ماخوذ ہے، تقویٰ سے نہیں، چنانچہ جو باپ اپنے بیٹے کی پیدائش کے وقت اس کا نام ''تقی'' رکھتا ہے، تو وہ اس شگون کے طور پر رکھتا ہے کہ وہ لڑکا تقیہ اور خلاف حقیقت کے اظہار میں فائق ہوگا۔

نشرح سے نکالی گئی ہے۔ان کو یہ بات کہتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی جب کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ سورۂ الم نشرح مکی سورۃ ہے،اور حضرت علی رضی اللہ عنہ مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد نہیں ہوئے تھے۔مکہ میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ایک داماد حضرت عاص رضی اللہ عنہ بن ربیع اموی تھے،جن کی تعریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کے منبر پر اس وقت کی تھی جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر (ان کے ہوتے ہوئے) ابوجہل کی لڑکی سے شادی کا ارادہ کیا تھا،اس پر حضرت فاطمہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی شکایت کی تھی۔اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ایک بیٹی کے نکاح سے تھے،تو اللہ رب العزت نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو دو بیٹیوں کے نکاح سے آپ کا داماد بنایا تھا،اور جب دوسری بیٹی کا انتقال ہوگیا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر ہماری کوئی تیسری بیٹی ہوتی تو آپ سے ہم اس کی بھی شادی کردیتے۔

اور شیعوں کے ایک عالم ابومنصور احمد بن علی بن ابی طالب طبرسی متوفی ۵۸۸ نے جو ابن شہر آشوب کے مشائخ میں سے ہیں،اپنی کتاب ''الاحتجاج علی أہل اللجاج''میں لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک بے دین سے کہا (ابومنصور نے اس کا نام نہیں لکھا جس سے حضرت علی نے کہا) کہ تمھارا مجھ پر غالب آنا اللہ تعالیٰ کے قول ﴿وإن خفتم ألا تقسطوا في اليتامىٰ فانكحوا ما طاب لكم من النساء﴾ وليس يشبه القسط في اليتامى نكاح النساء ولا كل النساء يتامى سے ٹکرانا ہے،اس سے بھی وہ بات ثابت ہوتی ہے جو میں نے پہلے کہی ہے کہ قرآن میں کتر بیونت کی گئی ہے،اور یہاں یتامیٰ اور نکاح نساء کا کچھ حصہ نکال دیا گیا ہے۔اور قرآن کا جو حصہ کم کیا گیا ہے،وہ موجودہ قرآن کا تہائی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھی ان کی افترا پردازی

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ان کی افترا پردازی ہے،اس کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے اپنی مدت خلافت میں قرآن کے اس مقام سے ساقط اس تہائی حصے کا اعلان نہیں کیا،اور نہ ہی اس کو باقی رکھنے،اس کو نافذ کرنے اور اس کے احکام کے مطابق عمل کرنے کا مسلمانوں کو حکم دیا۔

عیسائی مبلغوں کی خوشی

فصل الخطاب في إثبات تحريف كتاب رب الأرباب کے- جواللہ تعالیٰ اوراس کے برگزیدہ بندوں کی طرف منسوب اس طرح کے سیکڑوں جھوٹ سے بھری ہوئی ہے- تقریباً اَسّی (۸۰) سال پہلے منظر عام پر آنے اور ایران، نجف اور دوسرے شہروں کے شیعی حلقوں میں پھیلنے سے اسلام دشمن عیسائی مشنریوں کے چہرے خوشی سے کھل پڑے اور انھوں نے اس کتاب کا اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا، جیسا کہ محمد مہدی اصفہانی کاظمی نے اپنی کتاب **أحســن الــوديعة** میں جو کہ **روضات الجنات** کا ذیل ہے، جزء ثانی صفحہ ۹۰ پر لکھا ہے۔

کافی کلینی میں جو شیعوں کے نزدیک صحیح بخاری کی طرح ہے دو صریح عبارتیں ہیں، پہلی عبارت ایران سے شائع شدہ ۱۲۷۸ھ کے ایڈیشن میں یوں ہے کہ ''جابر جعفی سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے ابوجعفر علیہ السلام کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں نے پورا قرآن اس طرح یاد کیا جیسا وہ نازل ہوا تو وہ جھوٹا ہے، اس کو سوائے علی بن ابی طالب اور ان کے بعد کے ائمہ کے جیسا اترا ہے ویسا کسی نے جمع اور یاد نہیں کیا''۔

اور ہر وہ شیعہ جو اس کتاب الکافی کو پڑھتا ہے جس کا مرتبہ ان کے نزدیک وہی ہے جو ہمارے نزدیک صحیح بخاری کا ہے وہ اس پر ایمان رکھتا ہے۔ اور جہاں تک ہم اہل سنت کا سوال ہے تو ہمارا یہ کہنا ہے کہ شیعوں نے اس جھوٹ کو گھڑ کر ابوجعفر محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کیا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی مدت خلافت میں جب کہ وہ اپنے دارالخلافہ کوفہ میں مقیم تھے اس قرآن کے علاوہ پر عمل نہیں کیا، جس قرآن کو جمع کرنے، اس کو تمام بلاد و امصار میں پھیلانے اور آج تک بلکہ قیامت تک آنے والے ہر زمانے میں جس کے مطابق عمل کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اللہ دولت عطا فرمائی، اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اس قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن ہوتا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں جب کہ کاروبار خلافت میں ان کا کوئی شریک نہیں تھا، اس پر عمل کیا ہوتا اور مسلمانوں کو بھی اس کے مطابق عمل کرنے اور اس کی اشاعت کا حکم دیا ہوتا، اور اگر بالفرض ان کے پاس کوئی اور قرآن تھا اور انھوں نے اس کو مسلمانوں سے پوشیدہ رکھا، تو انھوں نے اللہ، اس کے رسول اور دین اسلام کے سلسلے میں خیانت کا ارتکاب کیا۔

اور جابر جعفی جس کا اس بیہودہ بات کے بارے میں دعویٰ ہے کہ اس نے اس کو حضرت ابوجعفر محمد باقر سے سنا ہے، تو وہ شیعوں کے نزدیک اگر چہ معتبر ہے، لیکن ائمہ مسلمین کی نگاہ میں وہ اپنی کذب بیانی و دروغ بافی میں مشہور ہے، ابو یحییٰ حمانی نے کہا کہ میں نے ابوحنیفہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے عطا سے اچھا اور جابر جعفی سے جھوٹا آدمی نہیں دیکھا (اس کے لیے مجلۃ الازہر ص ۳۰۷ ۲ے۱۳ھ میں ہمارا مضمون دیکھنا چاہئے)۔

کتاب الکافی میں حضرت ابوجعفر محمد باقر کی طرف منسوب اس جھوٹ سے بھی زیادہ جھوٹی بات ان کے لڑکے حضرت جعفر کی طرف گھڑ کر منسوب کی گئی ہے، جو کافی ہی کے صفحہ ۵۷ [(۱)] مطبوعہ ایران ۱۲۷۸ھ میں ہے، اور وہ یہ ہے کہ:

''ابوبصیر کہتے ہیں کہ میں ابوعبداللہ کے پاس گیا............ یہاں تک کہ ابوعبداللہ (یعنی جعفر صادق) نے کہا کہ ہمارے پاس فاطمہ علیہا السلام کا قرآن ہے............ ابوبصیر کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ فاطمہ کا قرآن کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ تمھارے قرآن کی طرح اس سے تین گنا زیادہ، خدا قسم اس میں تمھارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے''۔

ائمۂ اہل بیت کے نام سے شیعوں کی یہ خودساختہ عبارتیں بہت پرانی ہیں، اور ان کو محمد بن یعقوب کلینی رازی نے کتاب الکافی میں ایک ہزار سال پہلے درج کیا ہے، مگر یہ اس سے بھی پہلے کی ہیں کیونکہ وہ ان کو تشیع کی عمارت تعمیر کرنے والے اپنے دروغ گو اسلاف سے روایت کرتا ہے، اور (ان روایات کی قدامت کی ایک دلیل یہ ہے کہ) جس وقت اسپین (اندلس) عرب اور اسلام کے زیر نگیں تھا تو امام ابومحمد ابن حزم اسپین کے پادریوں سے ان کی کتابوں کی عبارتوں کے حوالے سے مناظرہ کیا کرتے تھے، اور ان کتابوں کے اندر تحریف بلکہ اصل ہی کی گمشدگی پر حجت اور دلیل قائم کیا کرتے تھے، تو وہ پادری ان کے رد میں اور ان کے خلاف یہ کہتے کہ شیعوں نے بھی تو قرآن کے اندر تحریف ہونے کا اقرار کیا ہے، ابن حزم اس کے جواب میں فرماتے کہ شیعوں کا دعویٰ قرآن اور مسلمانوں کے خلاف حجت نہیں ہے، کیونکہ شیعہ مسلمان نہیں ہیں (دیکھئے کتاب: الفصل في الملل والنحل از ابن حزم، ج ۲ ص ۱۸۲، طبعہ اولی، قاہرہ)۔

---

(۱) یہ عبارت ۱۳۸۱ھ کے ایڈیشن میں صفحہ ۲۳۸ پر ہے۔

حکام کے بارے میں شیعوں کا نظریہ

انتہائی خطرناک حقیقت جس کی طرف ہم اپنی اسلامی حکومتوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں یہ ہے کہ اثنا عشری امامی شیعہ (جن کو جعفری بھی کہا جاتا ہے) کا اصل مذہب اس خیال پر قائم ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات سے لے کر اب تک کی اسلامی حکومتیں- بجز حضرت علی بن ابی طالب کی چند سالہ حکومت کے- غیر شرعی حکومتیں ہیں، اور کسی شیعہ کے لیے یہ جائز نہیں کہ دل سے ان کے ساتھ اخلاص و وفاداری برتے، بلکہ ان سے پوشیدہ دشمنی رکھے، اور بچ بچا کر رہے، اس لیے کہ یہ تمام حکومتیں، جو اب تک گزر چکی ہیں وہ بھی، اور جو اس وقت ہیں وہ بھی اور جو آئندہ ہوں گی وہ بھی، سب کی سب غصب شدہ اور ہڑپی ہوئی حکومتیں ہیں، اور شیعوں کے عقیدے اور مذہب میں جائز اور قانونی حاکم صرف بارہ امام ہیں، خواہ ان کو حکومت حاصل ہو یا نہ ہو، ان کے علاوہ جتنے حاکم ہیں ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) سے لے کر آج تک، چاہے وہ اسلام کی جتنی بھی خدمت کرلیں، اور روئے زمین پر اشاعت اسلام، اعلاء کلمۃ اللہ اور ممالک اسلامیہ کی توسیع کے لیے چاہے جس قدر بھی محنت و جانفشانی کا مظاہرہ کرلیں، وہ قیامت تک ظالم و غاصب رہیں گے۔ (۱)

ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) سے نفرت

شیعہ حضرات ابوبکر و عمر و عثمان (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ ہر اس شخص پر جو خلیفہ وحاکم بنا لعنت کرتے ہیں۔ (۲) اور انھوں نے ایک جھوٹی روایت گھڑ کر حضرت ابوالحسن علی بن محمد بن علی

(۱) شیعوں کے ہاں ایک حدیث ہے جس کو انھوں نے حضرت جعفر صادق کی طرف گھڑ کر منسوب کیا ہے، جس کا عنوان ہے ''مقبولۃ عمر بن حنظلۃ''، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیعہ کے علاوہ کسی اور کو حکم بنانا شیطان کو حکم بنانا ہے۔ اور اسی پر خمینی نے حکومت اسلامیہ کے نظریے کی بنیاد رکھی ہے (حکومت اسلامیہ صفحہ ۷۰-۹۲) اور اسی کے مطابق ایرانی دستور تیار ہو کر نافذ ہوا، کیونکہ اس میں یہ صراحت ہے کہ صدر جمہوریہ شیعہ ہوگا (دفعہ: ۱۱۶، ۱۲۱) پھر شیعہ کو غیر شیعہ کے حکم بنانے سے بچانے کے لیے قومی مجلس شوریٰ پر یہ حرام قرار دے دیا گیا کہ شیعہ مذہب کے احکام وضوابط کے خلاف قانون سازی کرے (دفعہ: ۷۲) (سعید اسماعیل)

(۲) مثال کے طور پر ''یوم عاشورا کی زیارت'' کی دعا کو لیجیے، یہ شہادت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے دن کی ایک مخصوص دعا ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے خیال کے مطابق اللہ کا تقرب حاصل کرتے ہیں، اس میں آنحضرت ﷺ کے صحابۂ کرام پر بالواسطہ اور بلاواسطہ بیس سے زیادہ بار لعن کرتے ہیں، اس دعا میں مثلاً یہ مذکور ہے کہ ''اے اہل بیت! اللہ ان لوگوں پر لعنت کرے جنھوں نے تمھارے خلاف ظلم وجور کی بنیاد رکھی، اور اللہ ان لوگوں پر بھی لعنت کرے جنھوں نے تم کو تمھارے مقام سے دور اور اس مرتبے سے محروم کیا، جو اللہ نے تم کو عطا کیا تھا'' اور اس دعا میں مذکور خود ساختہ مقام سے مراد رسول اللہ ﷺ کے بعد سے قیامت تک خلافت وولایت ہے۔ اس کی رو سے سوائے شیعہ کے کون شخص رہ جاتا ہے جو مستحق لعنت نہ ہو؟ اور اس دعا میں بطور خاص یہ مذکور ہے: ''اللہ تمام بنی امیہ پر لعنت کرے............اے خدا تو ابوسفیان اور معاویہ اور یزید بن معاویہ پر لعنت کر، تو ان پر ہمیشہ ہمیش لعنت کر'' (سعید اسماعیل)

ابن موسی کی طرف منسوب کی ہے کہ انھوں نے ابوبکر وعمر کا ''جبت'' اور ''طاغوت'' نام رکھنے پر شیعوں کو برقرار رکھا ہے، چنانچہ شیعوں کی جرح وتعدیل کی سب سے بڑی اور مکمل کتاب **تنقیح المقال في أحوال الرجال** جو فرقۂ جعفریہ کے شیخ علامۂ ثانی آیت اللہ مامقانی کی تصنیف ہے، اس کے جلد اول صفحہ ۲۰۷ مطبوعہ مطبعہ مرتضویہ نجف ۱۳۵۲ھ میں شیعوں کے شیخ جلیل محقق محمد بن ادریس حلی کی کتاب السرائر کے آخر سے نقل کیا ہے کہ **مسائل الرجال ومكاتباتهم إلى مولانا أبي الحسن علي بن محمد بن علي بن موسى عليه السلام** نامی کتاب میں محمد بن علی بن عیسی کے سوالات کے ضمن میں مذکور ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کو (علی بن محمد بن علی بن موسی کو) لکھ کر ناصبی (یعنی جو اہل بیت سے دشمنی رکھے) کے بارے میں پوچھا کہ کیا اس کو جانچنے کے لیے جبت اور طاغوت کی تفضیل اور ان کی امامت کے اعتقاد سے زیادہ کی مجھ کو ضرورت پڑے گی (یعنی اس کو پرکھنے کے لیے آنحضرت ﷺ کے دونوں صحابی اور دست راست ابوبکر وعمر کی تفضیل وبرتری سے زیادہ کی ضرورت پڑے گی) تو انھوں نے جواب میں لکھا کہ جو اس عقیدے پر ہو تو وہ ناصب ہے۔ یعنی کسی انسان کو اہل بیت کا دشمن قرار دینے کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ وہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کو فضیلت دے اور ان کی امامت کا اعتقاد رکھے۔ اور جبت اور طاغوت کی تعبیر شیعہ اپنی اس دعا میں بھی استعمال کرتے ہیں جو ان کے ہاں **دعاء صنمي قريش** کے نام سے موسوم ہے، اور **صنمي قريش** (قریش کے دو بت) اور جبت وطاغوت سے مراد ان کے نزدیک ابوبکر وعمر ہیں، یہ دعا شیعوں کی کتاب **مفتاح الجنان** میں مذکور ہے، اور اس کے الفاظ یہ ہیں: **اللّٰهم صل على محمد وعلى آل محمد، والعن صنمي قريش وجبتيهما وطاغوتيهما وابنتيهما ...... الخ.**

اور **ابنتيهما** سے ان کی مراد ام المؤمنین حضرت عائشہ اور ام المؤمنین حضرت حفصہ **رضى الله عنهما وعن الجميع** ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاتل کی تعظیم

ایران میں آتش مجوسیت سرد کر دینے والے اور ایران والوں کے حلقہ بگوش اسلام ہونے والوں کے سبب بننے والے سیدنا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے شیعوں کی دشمنی یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاتل ابولولوۃ مجوسی کا نام بابا شجاع الدین رکھا ہے۔ ایک شیعہ راوی علی بن مظاہر نے شیخ الشیعہ احمد بن اسحاق قمی احوص سے روایت کیا ہے کہ عمر بن خطاب کے قتل کا دن عید اکبر کا دن، فخر کا دن، عزت کا دن، زکاۃ عظمی کا دن، برکت اور تسلی کا دن ہے۔

ابو موسیٰ مدینی کی خصائصِ مسند یا حسینی کی اِکمال اور حضرت محدث الاعظمی کی تحقیق

از: ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب المسند احادیث نبویہ طیبہ کا عظیم الشان ذخیرہ ہے، جس میں ستائیس ہزار (۲۷۰۰۰) سے زیادہ حدیثیں روایت کی گئی ہیں، یہ عظیم الشان کتاب جب سے تصنیف کی گئی، اسی وقت سے اس کی طرف علماء ومحدثین کی توجہ مبذول رہی، اور اس سے استفادہ وافادہ کا سلسلہ جاری رہا، اس کا مطالعہ اور اس سے کسبِ فیض کے علاوہ متعدد اہل علم نے حسب ضرورت مختلف جہتوں سے اس پر بحث وتحقیق کے جوہر دکھائے، اور اسلام کے علمی وتحقیقی سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا، کسی نے فقہی ترتیب پر اس کو مرتب کرنے کا کام انجام دیا، کسی نے اس کے غریب اور مشکل الفاظ کی تشریح وتفسیر کی، اور کسی نے اس کی سندوں کے رجال ورواۃ پر کتاب تصنیف کر کے اس کے راویوں کے حالات کو حوالۂ قلم کیا۔

اس سلسلے کی تصانیف میں ایک کتاب ۱۳۶۹ھ میں ''دلی پرنٹنگ ورکس دہلی'' سے طبع ہو کر ''کتب خانہ فخریہ، امروہہ گیٹ مرادآباد، یوپی'' سے شائع ہوئی ہے اور ۱۶۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سرورق پر کتاب کا نام یوں لکھا ہوا ہے:

خَصَائِصُ
مسند الإمام أبي عبداللّٰه أحمد بن محمد
ابن حنبل الشيباني رضي اللّٰه عنه

اس کے نیچے مصنف کے نام کے طور پر لکھا ہے کہ

من
إملاء الإمام الحافظ شمس الحفاظ أبي موسى محمد بن
أبي بكر عمر بن أبي عيسى أحمد بن عمر بن محمد الأصبهاني
المديني رحمه اللّٰه تعالىٰ

یعنی کتاب کا نام ''خصائص مسند الإمام أحمد بن محمد بن حنبل'' ہے، اور یہ امام وحافظ أبوموسی محمد بن عمر اصبہانی مدینی کی املاء کی ہوئی ہے۔ جو کہ علمی دنیا میں ابوموسیٰ مدینی کے نام سے غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔

مصنف کے مذکورہ بالا نام کے بعد سرورق پر چھ سطروں میں درج ذیل عبارت تحریر ہے:

تكفل بطبع هذا الكتاب المستطاب النادر الفقيد الذى لم يكن مطبوعاً من قبل المكتبة الفخرية امتثالاً لأمر حضرة الأستاذ الفاضل العلامة مولانا عبدالحق المدني، المدير في الجامعة القاسمية المعروف بمدرسة شاهى الواقع في مرادآباد (الهند) سنة تسع وستين بعد ألف وثلاث مائة من الهجرة النبوية على صاحبها ألف ألف صلاة وسلام.

یعنی یہ عمدہ، نادر اور بے مثال کتاب جواب تک غیر مطبوع تھی حضرۃ الاستاذ الفاضل علامہ مولانا عبدالحق مدنی مدیر جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد کے حکم کی اتباع میں ۱۳۶۹ھ میں مکتبہ فخریہ کی طرف سے اس کے خرچ پر طبع ہوئی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ زیر بحث کتاب کی طباعت واشاعت ''خصائص مسند الإمام أحمد'' کے نام سے ہوئی ہے، اور اس کے مصنف کا نام ابوموسی مدینی (متوفیٰ ۵۸۱ھ) ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت محدث الاعظمیؒ کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب نہ خصائص مسند الإمام أحمد ہے، اور نہ یہ ابوموسی مدینی کی تصنیف ہے، بلکہ اس کے مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک دوسری کتاب ہے جو غلطی سے خصائص کے نام سے چھپ گئی ہے، اور مصنف بھی ایک دوسرے عالم ومصنف ہیں، جو ابوموسیٰ مدینی کے بہت بعد کے ہیں۔ اس تحقیق کی تفصیل حسب ذیل ہے:

سرورق یا ٹائٹل کے بعد صفحہ ۳ پر ایک صفحے کا مصنف کا مقدمہ ہے، اور مقدمہ کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ مقدمہ سے پہلے اسی صفحے پر چند سطروں کی گنجائش ہے، اس میں حضرت محدث الاعظمی نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے:

الإكمال

(عن من في مسند أحمد من الرجال ممن ليس في تهذيب الكمال)

للحسينى رحمه الله

یعنی یہ کتاب **الإكمال عن من في مسند أحمد من الرجال ممن ليس في تهذيب الكمال** ہے (**خصائص مسند الإمام أحمد** نہیں ہے) اور کتاب کے مصنف حسینی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

اور پھر حسینی پر حاشیہ کا نمبر لگا کر نیچے ان کا نام ونسب یوں رقم کیا ہے:

هو الحافظ أبو المحاسن محمد بن علي بن الحسن بن حمزة الحسيني الدمشقي المتوفىٰ سنة ٧٦٥ یعنی مصنف کی کنیت اور ان کا پورا نام ونسب یہ ہے: حافظ ابوالمحاسن محمد بن علی بن حسن بن حمزہ حسینی دمشقی متوفی ۷۶۵ھ۔

ان عبارتوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ میں یہ خصائص کی بجائے الإکمال ہے، اور اس کے مصنف امام ابوموسیٰ مدینی متوفی ۵۸۱ھ کے بجائے محمد بن علی بن حسن بن حمزہ حسینی دمشقی متوفی ۷۶۵ھ ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں بھی ہے، اور اس نسخے پر بھی کتاب کا نام ''خصائص المسند'' درج ہے، حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے مرادآباد سے چھپے ہوئے اسی نسخے میں اوپر ایک گوشے میں لکھا ہے: **وفي دار العلوم (ندوة) بلكهنؤ نسخة خطية لهذا الكتاب طالعتها مرتين، وفي آخرها خصائص المسند لأبي موسىٰ المديني أيضاً.**

یعنی دارالعلوم ندوہ لکھنؤ کے کتب خانے میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ہے، میں نے اس کا دوبار مطالعہ کیا ہے، اس کے آخر میں بھی خصائص المسند لأبي موسی المدینی لکھا ہوا ہے۔

اب یہ بات تحقیق طلب ہوجاتی ہے کہ کتاب اور اس کے مصنف کا صحیح نام کیا ہے؟ مکتبہ فخر یہ مرادآباد کے مطبوعہ اور کتب خانۂ ندوہ کے مخطوطے پر جو درج ہے وہ صحیح ہے، یا حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے جو تحریر فرمایا ہے وہ صحیح ہے؟ یعنی یہ ابوموسیٰ مدینی کی **خصائص المسند** ہے، یا حسینی کی الإکمال؟

حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کی صحت کا ثبوت خود اس کتاب کے اندر موجود ہے، جو اس کی داخلی شہادت ہے اور بڑی شہادت ہے، چنانچہ اس کے مقدمے میں حمد وصلوٰۃ کے بعد یہ عبارت ہے:

فإنه لما قضى الله عز وجل لي في اختصار كتاب تهذيب الكمال في أسماء الرجال لشيخنا الحافظ الجيد أبي الحجاج المزي تغمده الله برحمته، وأسكنه بحبوحة جنته، أشار عليّ من تعيّن رعايته وتحتّم إجابته بإضافة رجال مسند الإمام أحمد بن حنبل إلى رجال التهذيب لتتم فائدته.

یعنی جب اللہ عز وجل نے مجھ کو اپنے شیخ حافظ ابوالحجاج مزی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **تهذيب الكمال في أسماء الرجال** کے اختصار کی توفیق عنایت فرمائی، تو کچھ مخلص کرم فرماؤں نے تہذیب کے رجال کے ساتھ مسند امام احمد کے رجال کے اضافہ کا مشورہ دیا، تا کہ اس سے فائدہ کی تکمیل ہو سکے۔

مقدمہ کی اس عبارت سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ زیر بحث کتاب کے مصنف **تهذيب الكمال في أسماء الرجال** کے مؤلف محدث وحافظ ابوالحجاج مزی کے شاگرد ہیں، اور اسی سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ یہ کتاب ابوموسی مدینی کی تصنیف نہیں ہے، کیونکہ ابوموسی مدینی کا سال وفات ۵۸۱ھ ہے، اور ابوالحجاج مزی نے جو اس کتاب کے مصنف کے استاد وشیخ ہیں ۷۴۲ھ میں وفات پائی ہے، حافظ مزی کا یہ سن وفات حضرت محدث الاعظمی ﷫ نے مقدمہ کی عبارت میں ان کے نام کے نیچے ہی درج کر دیا ہے۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ اس کے مصنف ابوموسی مدینی کے بہت زمانے کے بعد کے کوئی عالم ہیں، اور وہ مزی کے شاگرد ہیں، تو یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ یہ ابوحمزہ حسینی کی **الإكمال** ہی ہے، کیونکہ علامہ مزی کے شاگردوں میں حسینی نے **تهذيب الكمال** کا اختصار کیا ہے، اور مسند احمد کے رجال پر **الإكمال** کے نام سے کتاب تصنیف کی ہے۔

اس کے علاوہ احقر کا خیال ہے کہ اس کی تعیین کے لیے حضرت محدث الاعظمی ﷫ کے پاس اور بھی ثبوت وشواہد رہے ہوں گے، ہوسکتا ہے کہ کتاب کے محتویات اور حافظ ابن حجر کی کتاب تعجیل المنفعۃ سے مقابلہ کے بعد اس حتمی نتیجے تک پہنچے ہوں۔

حسینی کی یہ کتاب بعد میں بلاد عرب سے بھی شائع ہوئی ہے، جس کی تحقیق عبداللہ سُرور بن فتح محمد نے کی ہے۔ اس سے مقابلہ کے بعد اس یقین میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے کہ وہ حسینی کی **الإكمال** ہی

ہے، لیکن اس محقق نسخے پر کتاب کا نام الإکمال في ذکر من له روایة في مسند أحمد سوی من ذکر في تهذیب الکمال درج ہے۔ اور یہ نام حضرت محدث الاعظمی ؒ کے درج کیے ہوئے نام الإکمال عن من في مسند أحمد من الرجال ممن لیس في تهذیب الکمال سے قدرے مختلف ہے، مگر یہ اختلاف یا فرق کوئی بڑا فرق نہیں ہے، کیونکہ قدیم کتابوں کے قلمی نسخوں میں نام کا اس طرح کا جزوی فرق بکثرت رہتا ہے، چنانچہ خود اسی کتاب کے نام کے بارے میں تذکرہ وتراجم کی مختلف کتابوں میں جو فرق ہوا ہے، اس کو عبداللہ سرور نے یوں ذکر کیا ہے، کہ زرکلی نے الأعلام میں اس کا نام الإکمال في ذکر من له روایة في مسند الإمام أحمد بن حنبل لکھا ہے، اور اسماعیل پاشا نے إیضاح المکنون میں الإکمال بمن في مسند أحمد من الرجال ممن لیس في تهذیب الکمال لکھا ہے، اور علامہ محمد زاہد کوثری نے ذیل تذکرة الحفاظ میں الامتثال بما في مسند أحمد من الرجال ممن لیس في تهذیب الکمال تحریر فرمایا ہے۔

حضرت محدث الاعظمی ؒ نے اپنے نسخے مطبوعۂ مرادآباد میں جو نام درج کیا ہے، اس کو حافظ ابن حجر عسقلانی نے تعجیل المنفعة کے مقدمے میں ذکر کیا ہے، جس سے اس کا مستند ہونا معلوم ہوتا ہے۔

اس کتاب کا ایک خوش خط اور صاف نسخہ گجرات کے مقام پٹن کے مدرسہ کنز مرغوب میں ہے، راقم نے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے اس کی زیارت کی ہے، اس میں سرورق پر یہ عبارت درج ہے: هذه رسالة ذکر فیها من له روایة في مسند الإمام أحمد من الرجال سوی من ذکر في تهذیب الکمال. اس کے بعد لکھا ہوا ہے: تخریج الفقیر إلی الله الغني محمد بن علي بن الحسن بن حمزة الحسیني عفي عنه، مبتدیاً بعمله في سنة ثمان وخمسین وسبع مائة بدمشق، اس عبارت سے اس کتاب کے مسند احمد کے رجال پر حسینی کی تصنیف ہونے کے علاوہ یہ قیمتی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں کہ اس کی تصنیف کا آغاز ۷۵۸ھ میں دمشق میں ہوا۔

یہ تو کتاب اور اس کے مصنف کے نام کے سلسلے میں تفصیلات درج کی گئی ہیں، علاوہ ازیں کتب خانہ فخریہ مرادآباد کے جس ایڈیشن پر ہماری گفتگو ہے، وہ بہت غلط بھی چھپی ہے، بہت سی جگہ الفاظ چھوٹے ہوئے ہیں، کہیں کہیں کوئی لفظ کچھ سے کچھ ہو گیا ہے، حضرت محدث الاعظمی ؒ نے بہت سے مقامات پر تصحیح وتصویب فرمائی ہے، لیکن اس وقت اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

''مسجد نبوی کے فضائل''

تحریر: جمال الدین محمد بن احمد المطری   ترجمہ: مولانا انور رشید الاعظمی استاذ مرقاۃ العلوم، مئو

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں کہ صرف تین مسجدوں کے لیے رخت سفر باندھا جائے، میری یہ مسجد، مسجد حرام، اور مسجد اقصیٰ، (بخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری مسجد میں نماز ادا کرنا مسجد حرام کے علاوہ دوسری مسجدوں میں ادا کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے، اور میرا منبر جنت کی ایک نہر پر ہے، اور میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان والا حصہ جنت کا ایک باغ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میری اس مسجد میں نماز ادا کرنے کا ثواب مسجد حرام کے علاوہ دوسری مساجد میں نماز ادا کرنے سے ہزار درجہ افضل ہے، (مسلم)

ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن اور ابوعبداللہ اغر یہ دونوں قبیلۂ جہینہ کے لوگوں کے غلام تھے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے رفقاء میں سے ان دونوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں نماز ادا کرنے کا ثواب مسجد حرام کے علاوہ دیگر مساجد میں نماز ادا کرنے سے ہزار درجہ فضیلت رکھتا ہے، یہ بات یقینی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور آپ کی مسجد بھی آخری مسجد ہے، ابوعبداللہ کہتے ہیں کہ یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کررہے تھے اسی لئے ہم ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کی تحقیق وتفتیش کے سلسلہ میں باز رہے (ہم نے اس حدیث کی تحقیق نہیں کی) پھر جب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو اس وقت ہمیں یہ بات یاد آئی اور ہم نے ایک دوسرے کو ملامت کیا کہ ہم نے کیوں نہیں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس سلسلہ میں گفتگو کی، تاکہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کی سند بیان کرتے اگر انھوں نے یہ حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی

ہے، اسی دوران ہم عبداللہ بن ابراہیم بن قارض کی مجلس میں شریک ہوئے تو ہم نے اس حدیث کا تذکرہ کیا جس کے بارے میں ہماری طرف سے کوتاہی ہوئی اور وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا صریح قول تھا جو آپ سے منقول تھا، تو ہم سے عبداللہ بن ابراہیم نے کہا کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ میں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو سنا وہ کہہ رہے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں خاتم الانبیاء ہوں اور یہ کہ میری مسجد آخری مسجد ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھیں یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچی ہے کہ صرف تین ہی مسجدوں کے لیے رخت سفر باندھا جائے گا، میری یہ مسجد، مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ۔

حمید الخراط بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میرے پاس سے عبدالرحمٰن بن ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا گذر ہوا، کہتے ہیں کہ میں نے عبدالرحمٰن سے کہا کہ تم نے اپنے والد کو اس مسجد کے سلسلہ میں جس کی بنیاد تقویٰ پر ہے، کیسی گفتگو اور تذکرہ کرتے ہوئے سنا؟ انھوں نے جواب میں کہا کہ میرے والد نے مجھ سے کہا کہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایسے وقت میں حاضر ہوا کہ آپ اپنی بعض ازواج مطہرات کے گھر میں قیام فرما تھے۔ میں نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! دو مسجدوں میں وہ کون سی مسجد ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر قائم ہے؟ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشت بھر کنکری لی اور اس کو زمین پر مار کر فرمایا کہ وہ تمھاری یہ مسجد ہے، یقیناً وہ مسجد مدینہ ہے، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے عبدالرحمٰن بن ابوسعید خدری سے کہا کہ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ میں نے تمھارے والد کو اسی طرح تذکرہ کرتے ہوئے سنا ہے۔

سلمان اغر بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ سفر تو صرف تین ہی مسجدوں کا ہوتا ہے، مسجد کعبہ (مسجد حرام) میری مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد ایلیا (بیت المقدس)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صرف تین ہی مسجدوں کے لیے سامان سفر باندھا جائے گا، مسجد حرام، مسجد نبوی، اور مسجد اقصی، (بخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری اس مسجد (مسجد نبوی) میں نماز ادا کرنا مسجد حرام کے علاوہ دیگر مساجد میں نماز ادا کرنے سے ہزار

گنا فضیلت رکھتا ہے۔ (بخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے، کہتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں خاتم الانبیاء ہوں۔ اور میری مسجد انبیاء کی مساجد میں آخری مسجد ہے، ساری مساجد میں وہ سب سے زیادہ اس بات کی مستحق ہے کہ اس کی زیارت کی جائے، اور اونٹوں پر سوار ہوکر وہاں کا سفر کیا جائے میری اس مسجد میں نماز ادا کرنا، مسجد حرام کے علاوہ دوسری مساجد میں نماز ادا کرنے سے ہزار درجہ فضیلت رکھتا ہے۔ (مجمع الزوائد، ہیثمی)

حضرت ابوامامہ بن سہل بن حُنیف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص پاک وصاف ہوکر صرف میری مسجد میں نماز ادا کرنے کے ارادے سے نکلے اور اس میں نماز بھی ادا کرلے تو اس کا یہ نکلنا حج کے قائم مقام ہے[(۱)]

حضرت سہل بن سعد سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص میری اس مسجد میں اچھی اور بھلی بات (دین کی بات) سیکھنے یا سکھانے کی غرض سے داخل ہوا تو وہ مجاہد فی سبیل اللہ کے رتبہ کو پہنچ گیا، اور جو شخص اس کے علاوہ کسی دوسری غرض، مثلاً دنیاوی باتوں کے لیے داخل ہوا تو ایسا شخص اس شخص کے مانند ہے جو تعجب خیز اور عمدہ چیزیں دیکھتا ہے اور وہ چیز دوسرے کی ملکیت ہے۔
(معجم طبرانی، ابن حبان، مجمع الزوائد)

(۱) اس حدیث کی سند منقطع ہے، اور امام بخاری نے تاریخ کبیر کے اندر دوسرے طریق سے بطریق موصول روایت کیا ہے۔

منبر رسول ﷺ اور روضۂ اطہر کے درمیانی حصہ کی فضیلت وعظمت

حضرت عبداللہ بن زید المازنی رضی اللہ عنہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو حصۂ زمین میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان ہے وہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو حصۂ مبارک میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان میں ہے وہ جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہوگا۔ (بخاری)

حضرت عبداللہ بن زید مازنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ حصۂ زمین جو میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان ہے وہ بہشت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔ (بخاری)

حضرت عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اکرم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو حصۂ زمین میرے منبر اور میرے گھر کے درمیان ہے وہ جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔ (مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو خطۂ زمین میری قبر اور میرے منبر کے درمیان واقع ہے وہ جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔ (مسند احمد و مجمع الزوائد)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو حصہ میرے کمرہ اور میرے منبر کے درمیان ہے وہ جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے، اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ میرا منبر جنت کی نہروں میں سے ایک نہر پر ہوگا، اور صحیحین کے بعض طرق میں ''ومنبري على حوضي'' میرا منبر میرے حوض پر ہوگا، کے الفاظ ہیں، میں کہتا ہوں (مصنف مراد ہیں) کہ آنحضور ﷺ کی قبر مبارک آپ کے گھر میں ہے اور یہی گھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرۂ مبارک ہے، اس لیے روایات میں اتفاق ثابت ہے، اللہ رب العزت کا شکر واحسان ہے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ منبر کے پائے جنت کے اندر ثابت وقائم رہیں گے، (مسند احمد) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہونے کے لیے آنے والے کے لیے علمائے کرام مستحب قرار دیتے ہیں کہ وہ حرم شریف میں اولین داخلہ کے وقت قبر مبارک اور منبر کے درمیان والے حصۂ زمین کا قصد کرے، پھر اس میں دو رکعت (نفل) ادا کرے، اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے جلد قدم بڑھائے۔

آقائے نامدار جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا بیان

مسجد نبویؐ میں حجرات کے شامل ہونے سے قبل لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام عرض کرنے کی غرض سے کھڑے ہوتے تھے تو اس وقت اس ستون کا استقبال کرتے تھے جس میں لکڑی کا صندوق تھا اسی پر وہ ستون بھی قائم تھا، جو حجرہ کی اس مغربی دیوار سے لگا ہوا تھا جسے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ[1] نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے اردگرد تعمیر کیا تھا، اور اس وقت روضہ اور اسطوانۂ توبہ لوگوں کے عقب میں ہوتا تھا، یہ بات حضرت زین العابدین بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منسوب ہے کہ وہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پیش کرنے کی غرض سے حاضر ہوتے تھے تو اس اسطوانہ کے پاس ٹھہرا کرتے تھے جو روضۂ اطہر کے قریب اور متصل تھا، اور اس ستون کا استقبال کرتے تھے جس میں آج بھی صندوق موجود ہے[2] اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سلام عرض کرتے تھے، پھر اس کے بعد حضرت ابوبکر پر اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہما پر، اور کہا کرتے تھے کہ یہاں پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک تھا، مگر جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک گھر بھی مسجد میں شامل کرلیا گیا اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن[3] کے کمرے بھی مسجد میں آگئے تو لوگ اس جگہ کھڑے ہوکر سلام پیش کرنے لگے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک سے قریب ہے، اور آپ پر سلام پیش کرتے وقت اور دعا مانگنے کے وقت قبلہ کی جانب اپنی پشت کرلیتے تھے۔

(۱) عمر بن عبدالعزیز نے خلیفہ بننے سے قبل اس وقت تعمیر کیا تھا جب وہ مدینہ کے گورنر تھے، یہ ولید کی خلافت کا زمانہ تھا۔
(۲) یہ صندوق مصنف کتاب کے زمانہ میں موجود تھا مگر اب اس کا کوئی وجود نہیں۔
(۳) ولید بن عبدالملک کی خلافت اور عمر بن عبدالعزیز کی مدینہ میں امارت کے زمانہ میں مسجد نبوی کی توسیع کے وقت یہ کمرے مسجد میں شامل کیے گئے۔

رسول اکرم ﷺ پر سلام پیش کرنے کے لیے قبلہ کی جانب پشت کرنا مستحب ہے جیسا کہ خطبۂ جمعہ وخطبۂ عیدین اور باقی تمام مشروع خطبوں میں جانب قبلہ پشت کرنا مستحب ہے اور جیسا کہ عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کے متعلق مذکور ہے کہ وہ جس وقت رسول اکرم ﷺ پر سلام عرض کرنے کے لیے کھڑے ہوئے اور اس وقت ان کے ساتھ امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے تو ابوجعفر نے امام مالک سے سوال کیا کہ اے ابوعبداللہ (امام مالک کی کنیت) میں قبلہ کا استقبال کرکے دعا مانگوں؟ یا رسول اکرم ﷺ کی طرف رخ کروں اور دعا مانگوں؟ تو امام مالک نے جواب میں کہا کہ تم کیوں کر رسول اکرم ﷺ کی طرف سے اپنا چہرہ پھیروگے جب کہ آنحضور ﷺ قیامت کے دن تمھارے اور تمھارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے اللہ رب العزت تک پہنچنے کا وسیلہ اور ذریعہ بنیں گے۔ (۱)

ابن ابی ملیکہ کہتے تھے کہ جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ قیام کے وقت نبی کریم ﷺ کی مواجہت کرے تو اسے اس قندیل کو جو قبر شریف کے پاس قبلہ کی سمت میں ہے اپنے سر کے قریب کر لینا چاہئے۔

شیخ امین الدین ابوالیمن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ہمارے شیخ ابوعمرو رحمۃ اللہ علیہ نے ہم سے بیان کیا اور مکہ کے ایسے مشائخ اور علماء زمانہ کا تذکرہ کیا جن میں سے بعض کو ہم نے بھی پایا، کہ سلام عرض کرنے کی غرض سے زیارت کرنے والا قبلہ کی جانب سے قبر مبارک کے پاس آئے اور قبر مبارک کے سر سے مکمل چار ہاتھ کے مقابل دوری پر کھڑا ہو، اور قندیل کو سر کے پاس کرلے، اپنی نگاہ نیچی رکھے، قبر اطہر کی دیوار کے مقابل نیچے حصہ کی جانب دیکھتا رہے، کیونکہ یہ رعب وجلال کا مقام ہے، پھر سلام پڑھے لیکن آواز بلند نہ ہو بلکہ درمیانی آواز سے یوں سلام عرض کرے: **السلام علیک یا رسول اللّٰہ، السلام علیک یا نبی اللّٰہ ، السلام علیک یا حبیب اللّٰہ.**

میں کہتا ہوں (مصنف کتاب) کہ مجھ سے شیخ عادل عارف باللہ نمونۂ اسلاف ابومحمد عبداللہ ابن عمران الیسکری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ شیخ عادل امام ابوالحسن علی بن عبداللہ بن عبدالجبار شاذلی حسنی

---

(۱) قاضی عیاض نے شفاج ۲ ص ۴۰، ۴۱ میں ابن حمید عن مالک کے طریق سے یہ قصہ نقل کیا ہے، جب کہ ابن حمید ضعیف ہیں اور ان کے اور مالک کے درمیان سند کے اندر انقطاع ہے، ساتھ ہی اس کا بھی ثبوت ہے کہ امام مالک دعا کے وقت قبر مبارک کی طرف رخ نہیں کرتے تھے، اس لیے کہ حجرہ کا استقبال صرف سلام پڑھنے کے وقت ہے جس کے قائل امام مالک وشافعی واحمد ہیں، فتاویٰ ابن تیمیہ ۲۷/۳۳۰۔

رحمۃ اللہ علیہ (اللہ تعالیٰ ان کے فیوض وبرکات سے لوگوں کو نفع پہنچائے) نے حجرۂ مبارکہ کے بالمقابل کھڑے ہوکر یوں سلام عرض کیا: السلام عليک سيدنا رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم السلام عليک أيها النبي ورحمة اللّٰه وبركاته، صلى اللّٰه عليک يا رسول اللّٰه، صلى اللّٰه عليک يا رسول اللّٰه أفضل وأزكى وأنمى وأعلى صلاة صلاها على أحد من أنبيائه وأصفيائه، أشهد يا رسول اللّٰه أنک بلغت ماأرسلت به، ونصحت أمتک وعبدت ربک حتى أتاک اليقين، وكنت كما نعتک اللّٰه في كتابه (لقد جائكم رسول من أنفسكم عزيز عليه ما عنتم حريص عليكم بالمؤمنين رؤوف رحيم) فصلوات اللّٰه وملائكته وأنبيائه ورسله وجميع خلقه، من أهل سماواته وأرضه، عليک يا رسول اللّٰه.

السلام عليكما يا صاحبَی رسول اللّٰه، يا أبا بكر ويا عمر، ورحمة اللّٰه وبركاته، فجزاكما اللّٰه عن الإسلام وأهله، أفضل ما جازیٰ به وزيرَی نبی فی حياته، وعلى حسن خلافته في أمته بعد وفاته، فلقد كنتما لرسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم وزيرَی صدقٍ في حياته، وخلفتماه بالعدل والإحسان بعد وفاته، فجزاكما اللّٰه عن ذلک مرافقته في جنته، وإيانا معكما برحمته، إنه أرحم الراحمين اللّٰهم إني أُشهِدُکَ وأُشهِدُ رسولَکَ وأبابكر وعمر، وأُشهد الملائكة النازلين على هذه الروضة الكريمة والعاكفين عليها، أني أشهد أن الا إله إلا اللّٰه وحده لا شريک له، وأن محمداً عبده ورسوله، وأشهد أن كل ما جاء به من أمر أو نهى وخبرٍ عما كان ويكون ، فهو حق لا كذب فيه، ولا إمتراء، وإني مُقرلک يا الهی بجنايتی ومعصيتی فی الحضرة والفكرة والإرادة والغفلة وما استأثرت به عنی مما إذا شئت أخذت به، وإذا شئت عفوت عنه، مما هو متضمن للكفر أوالنفاق، أوالبدعة أوالضلالة، أوالمعصية، أوسوء الأدب معک ومع رسولک ومع انبيائک وأوليائک من الملائكة، والجن والإنس وماخصصت من شيئ في ملكک، فقد ظلمت نفسي بجميع ذلک، فاغفرلي وامنن عليَّ بالذى مننت به على أوليائک

فإنک المنان الغفور الرحیم.

میں کہتا ہوں کہ سلام پڑھنے والے کے حق میں سب سے بہتر سلام یہ ہے: السلام علیک یا خاتم النبیین، السلام علیک یا شفیع المذنبین، السلام علیک یا امام المتقین، السلام علیک یا قائد الغر المحجلین، السلام علیک یا رسول رب العالمین، السلام علیک یا منة اللّٰہ علی المؤمنین، السلام علیک یاطه، السلام علیک یا یس، السلام علیک وعلی أهل بیتک الطیبین الطاهرین، السلام علیک وعلی أزواجک الطاهرات المبرآت أمّهات المؤمنین، السلام علیک وعلی أصحابک أجمعین ورحمة اللّٰه وبرکاته، جزاک اللّٰه عنا یا رسول اللّٰه أفضل الجزاء وصلی علیک أفضل الصلوات.

اور اگر وقت میں گنجائش ہوتو سب سے بہتر ان الفاظ کے ساتھ سلام پڑھنا ہے، السلام علیک یا من سفرت لوامع مجده، السلام علیک یا من همرت هوامع رفده، السلام علیک یا من طهرت أنوار علاه، السلام علیک یا من بهرت آثار سناه، السلام علیک یا نتیجة الشرف الباذخ، السلام علیک یا سلالة المجد الراسخ، السلام علیک یا جوهرة الشرف الأعلی، السلام علیک یا واسطة العقد المُحلیٰ، السلام علیک یا إمام الأنبیاء، السلام علیک یا صفوة الأصفیاء، السلام علیک یا معنی الوجود، السلام علیک یا منبع الکرم والجود، السلام علیک یا درة لؤی، السلام علیک یا غرة قصی،السلام علیک یا نبعة المکارم، السلام علیک یا سلالة الأکارم، السلام علیک یا ذا المحامد یا أبا القاسم، السلام علیک یا من عظمت هباته، السلام علیک یا من بهرت آیاته، السلام یا من ظهرت آیاته، السلام علیک ورحمة اللّٰه وبرکاته.

ابن ابی فدیک اپنی سند سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے بعض لوگوں سے جن کو میں نے پایا ہے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ جو شخص نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کے پاس کھڑا ہوکر یہ آیت کریمہ تلاوت کرے ''إن اللّٰه وملٰئکته یصلّون علی النبی '' اور پھر

صلى اللّٰه عليک يا محمد ستر بار کہے تو ایک فرشتہ اس کو ندا دیتا ہے اور کہتا ہے صلى اللّٰه عليک يا فلان تمھاری کوئی ضرورت ادھوری نہیں رہے گی۔

میں کہتا ہوں کہ حجرۂ مبارکہ کے بالمقابل قندیل کے نیچے سلام عرض کرنے کی غرض سے قیام سے متعلق جو مذکور ہے یہ مسجد نبوی میں آگ لگنے کے واقعہ سے قبل کی بات ہے، اس وقت رسول اکرم ﷺ کے رخ انور کے بالمقابل صرف ایک قندیل تھی، لیکن مسجد کی تجدید کے بعد کئی ایک قندیلیں موجود تھیں، اور اب تو چہرۂ مبارک کے سامنے وقوف کرنے کی علامت چاندی کی کیل ہے جو سرخ پتھر کے اندر ثبت ہے [1] اگر آدمی دیوار کے نچلے حصہ کی جانب دیکھتے ہوئے اس کا سامنا کرے تو وہ سرورکائنات رسول اکرم ﷺ کی مواجہت کرے گا، پھر وہاں سے دائیں جانب بقدر ایک ہاتھ کے ہٹ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر سلام پڑھے، پھر دائیں ہی بقدر ایک ہاتھ ہٹ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر سلام پڑھے، اور اگر چاہے تو ان الفاظ میں سلام پڑھے، ''السلام عليک يا من بادر بالإيمان من غير توقف، السلام عليک يا من لم تستمله الدنيا بزخرف، السلام عليک يا من أنفق في ذات اللّٰه ورسوله ماله قليله وجليله، ولم يترک لنفسه ولا لأهله إلا اللّٰه ورسوله، السلام عليک يا من تشرف بجميل المصاحبة في الغار والعريش والطريق''[2] السلام عليک يا أفضل الخلفاء يا أبا بكرن الصديق.

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جی چاہے تو ان الفاظ میں سلام پیش کرے: السلام عليک ياأمير المؤمنين، السلام عليک يامن أيد اللّٰه به الدين وختم به الأربعين [3] السلام عليک يامن آزر الإسلام فتمهد بعزائمه واتضح، ومصّر الأمصار وللأقاليم افتتح، السلام عليک يامن لا تاخذه فى اللّٰه لومة لائم فلم يدع الحقُ له صديقا، السلام عليک يامن مالقيه الشيطان سالكا طريقا إلا اتخذ غير طريقه طريقا، السلام عليک يامحدّث هذه الأمة الناطق بالصواب، السلام عليک ياأمير المؤمنين عمر ابن الخطاب، أشهد أنكما خلفتما رسول اللّٰه ﷺ فى أمته بأحسن الخلف،

(۱) یہ مصنف کے زمانے کی بات ہے جس کا اب وجود نہیں۔
(۲) غار ثور اور غزوۂ بدر میں سایہ حاصل کرنے کے لیے چھولداری اور واقعۂ ہجرت کی طرف اشارہ ہے۔
(۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے وقت کی عمر بتانا مقصود ہے اس وقت مکمل چالیس سال تھی۔

وسلكتما طريقته وشَيَّدتُما شريعته، وكنتما له خليفتي صدق وإمامي عدلٍ وحق، فجزاكما الله عن نبيكما وعن الإسلام وأهله خير جزاء، وأبد لكما أشرف منازل الصديقين والأولياء، وأنا لكما أفضل ما أنا له أحداً من خلفاء الأنبياء ونفعنا بهذه الزيارة والمحبة، وحشرنا مع نبينا ومعكما وسائر الأحبة، السلام عليكما ورحمة الله وبركاته.

آج کل رسول اکرم ﷺ پر سلام پڑھنے کے لیے جو جگہ ہے وہ ام المؤمنین حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا کا صحنِ خانہ ہے، کیونکہ ازواج مطہرات کے کمرے مغربی جہت کو چھوڑ کر ہر سمت سے مسجد کو گھیرے ہوئے تھے، مغربی جانب ان کے کمروں سے خالی تھی، اس لیے سلام پیش کرنے والا مغربی سمت سے درابزین (۱) کے اندر کھڑا ہو یا اس کے باہر بہر صورت وہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا کمرہ ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جو شخص بھی آپ کی زیارت سے مشرف ہونا چاہے اس کے لیے مناسب ہے کہ ان مقامات ومساجد کی زیارت کا بھی قصد کرے جہاں آپ ﷺ نے نماز پڑھی ہے، اس سے تبرک حاصل کرے وہاں دعا کرے، اور اس میں نماز بھی پڑھے آپ ﷺ کی اقتداء میں اور حصول برکت کے لیے، اس عمل کے مستحب ہونے پر اہل اسلام کا اجماع واتفاق ہے۔

(۱) درابزین فارسی لفظ ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اصلاً یونانی ہے حاجز اور رکاوٹ کے معنی میں۔

اسلامی کتب خانے

(سترہویں قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جہنی　　　ترجمہ وتلخیص: مسعود احمد الاعظمی

خاتمہ:

گزشتہ معروضات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ علماء ومؤرخین ومحققین کے درمیان اسلامی تاریخ میں مدارس کے آغاز کے سلسلے میں بڑا اختلاف ہے، ان مختلف نظریات کے درمیان اس طرح تطبیق دی جاسکتی ہے کہ نظام الملک طوسی کے قائم کردہ مدارس سے پیشتر کی اکثر درس گاہیں مقامی اور محدود تھیں، اوران کے وسائل معمولی تھے، اگر چہ بعض ایسے مدارس بھی تھے جن کو مسلمان امراء نے کچھ اہل علم کے واسطے بطور خاص قائم کیا تھا، مگر ان کا موازنہ نظام الملک کے مدارس سے نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ نظام کے مدارس کے مقابلہ میں ان کا دائرۂ عمل بہت محدود تھا۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی تعلیم وثقافت پر ان مدارس نے گہرا اثر چھوڑا، اور بلفظ دیگر ان حکومتی مدارس کے لیے انھوں نے راہ ہموار کی، جنھوں نے سابقہ مدارس کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔

نظام الملک کے مدارس:

یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ نظام الملک نے اس قدر بڑی تعداد میں جو مدارس قائم کیے، ان کی نہایت شاندار اور مضبوط عمارتیں بنوائیں، ان کا نظام مقرر کیا، یہ اتنا زبردست کام تھا جو نہ اس سے پہلے ہوا تھا اور نہ اس زمانے میں اس کی کوئی نظیر تھی۔

یہ تعلیمی امور میں حکومت کی دخل اندازی، اور دینی ودنیوی امور میں لوگوں کے خیر کے لیے اعتقادی اور تربیتی لحاظ سے ان کی رہنمائی کا بھی نقطۂ آغاز تھا۔

نیز اسلامی تاریخ میں یہ اولین سیاسی عمل شمار کیا جاتا ہے جس کو اسلامی اسٹیٹ نے مدارس کے نظام کو اپنانے، تعلیم کی سرپرستی، درس کی تنظیم، اس کی پیش رفت کے واسطے ضروری وسائل کی فراہمی کے لیے انجام دیا، جب کہ اس سے پہلے تعلیم ذاتی کوششوں پر منحصر تھی۔

چنانچہ نظام کے مدارس کے بارے میں ایک محقق نے لکھا ہے کہ ''وہ تعلیم وتربیت کا اولین سیاسی ادارہ تھا، جس کے اہداف کی تحدید، طریقۂ کار کی تنظیم، اساتذہ کے انتخاب میں حکومت نے دخل اندازی کی، اوراس کے لیے باقاعدہ اخراجات کا انتظام کیا۔

نظام الملک کا یہ کارنامہ اس وجہ سے اہمیت کا حامل ہے کہ وہ اسلامی تاریخ میں مدارس کے فروغ کی تحریک کا نقطۂ آغاز تھا، کیونکہ اس کے بعد سے اعیان سلطنت اورارکان دولت نے مدارس کی تعمیر میں دلچسپی لینا شروع کیا۔

اسی طرح نظام الملک نے مدارس کی تعمیر میں جس کوشش وکاوش کا مظاہرہ کیا، اس نے مدرسہ کی تشکیل میں دوررس اثر چھوڑا۔ اوراس نے طلبہ کے لیے جو تنظیم اور ترتیب وتقسیم قائم کی وہ بعد میں قائم ہونے والے مدارس کے لیے مشعل راہ بن گئی۔

اس پر یہ اعتراض نہیں ہونا چاہئے کہ عہد اسلامی میں مدرسہ کے قیام سے پہلے ہی علم ترقی کر چکا تھا، اوراس سے پہلے ہی سے مسلمانوں کی علمی وفکری تخلیقات عظیم الشان تھیں، اس لیے کہ توفیق ربانی اور فضل یزدانی سے مسلمانوں کے ارادے اور حوصلے ابتدائی زمانۂ اسلام میں ہر رکاوٹ کو مغلوب کرلیا کرتے تھے۔

مگر پانچویں صدی میں اوراس کے بعد حوصلوں میں پستی آنے لگی، تو علم وعلماء پر توجہ دینا اور اس کے لیے اسباب بہم پہنچانا ضروری ہوگیا۔

اسی لیے نظام الملک کا عمل اجتماعی اور انتظامی مصلحین Social and administrative reformers کے عمل سے زیادہ مشابہ تھا۔

اور نظام الملک کا یہ عمل اپنی ذات میں اتنا عظیم الشان تھا کہ اس کے ذریعے اس نے علمی وثقافتی تحریک کو محفوظ کردیا، اوراس کی عمارت کو گرنے اور برے انجام تک پہنچنے سے بچالیا۔

تعلیمی تحریک اوراس کے قافلے کو آگے بڑھانے میں نظام کا زبردست رول ہے، نظام کے

قائم کیے ہوئے مدارس نے کاروان تعلیم کی پیش قدمی اور ترقی میں عظیم الشان کردار ادا کیا، کیونکہ ان مدارس کے دروازے امت مسلمہ کے جگر گوشوں کے لیے وا کردیے گئے تھے، اور انھوں نے بڑے بڑے اسلامی شہروں کے بے شمار طلبہ کو اپنے دامن میں پناہ دے رکھا تھا۔

بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے طرز پر جو کہ شہرۂ آفاق تھا، اور جو مختلف شہروں کے طلبہ کا کعبۂ مقصود تھا، اور جس کا کتب خانہ ہزاروں بیش قیمت کتابوں پر مشتمل تھا، مشرقی علاقوں اور شہروں میں بھی مدارس قائم ہوئے۔ بلخ، نیشاپور، ہرات، اصفہان، بصرہ اور موصل جیسے شہروں میں مدارس قائم کیے گئے، جن کو ابن الاثیر نے ''کامل'' کے متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔

دیار مصر میں اسلامی مدارس فاطمی حکومت کے زوال اور صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں حکومت بنی ایوب کے قیام کے بعد وجود میں آئے، اس عہد میں مدارس کا بہت پھیلاؤ ہوا، اور یہ پھیلاؤ مملوکوں کے عہد تک جاری رہا، صرف قاہرہ میں مدارس کی تعداد تقریباً ۷۳ تک پہنچ چکی تھی، جن میں سے بیشتر چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں قائم کیے گئے تھے۔

شام میں البتہ مدارس بہت پہلے سے رواج پذیر تھے، امیر شجاع الدولہ صادر بن عبداللہ نے سب سے پہلا مدرسہ ۳۹۱ھ کے قریب دمشق میں قائم کیا تھا، وہ مدرسہ صادریہ کے نام سے موسوم تھا اور مذہب حنفی کے مطابق تھا۔

ان کے بعد ان کی پیروی میں امین الدولہ سبکتگین نے ۵۱۴ھ میں مدرسہ امینیہ قائم کیا، یہ پہلا مدرسہ تھا جو شام میں شافعیوں کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

بہت سے مؤرخین کا خیال ہے کہ دمشق میں پہلا مدرسہ نور الدین زنگی (۵۴۱-۵۶۹) نے قائم کیا تھا، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے قائم کردہ بہت سے مدارس تھے، اور شام کے گاؤں اور شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔

یہ مدارس ''مدارس نوریہ'' کے نام سے معروف تھے، ان میں مشہور ترین دمشق کا مدرسہ نوریہ تھا، جس کو ابن جبیر سیاح نے اس کے افتتاح کے کئی سال کے بعد دیکھا تھا، اور اس کو ایسے انداز میں بیان کیا ہے، جس سے اس کی عظمت شان کا پتہ چلتا ہے۔ اس مدرسے کی عمارت آج تک باقی ہے، اگرچہ اس کا ایک حصہ ٹوٹ کر گر گیا ہے۔

ابن جبیر نے ۵۸۰ھ=۱۱۸۴ء کے اوائل میں دمشق کی سیاحت کی ہے، اور اس کا بیان ہے کہ اس نے ۲۰ مدرسے دمشق میں اور ۶ حلب میں دیکھے ہیں۔

عبدالقادر نعیمی-متوفی ۹۲۷ھ=۱۵۲۰ء کی کتاب "**الدارس في تاريخ المدارس**" میں دمشق کے مدارس اوران کے اساتذہ وطلبہ کا نہایت تفصیلی اور دلچسپ تذکرہ ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اس موضوع کی نہایت اہم اور قابل قدر کتاب ہے۔

حجاز-اور خاص طور سے مکہ مکرمہ-میں اور حرم سے متصل مدارس قائم کیے گئے، مکہ مکرمہ میں سب سے پہلا مدرسہ ۵۷۹ھ=۱۱۸۳ء میں قائم کیا گیا، اس کا نام مدرسہ زنجبیلی تھا[(۱)]، جو حنفی مسلک کے لوگوں کا تھا، اور ایک مدرسۂ ارسوفی تھا جو ۵۹۲ھ میں تعمیر کیا گیا تھا[(۲)]، ان کے علاوہ دوسرے اور بھی مدارس تھے، جو مکہ مکرمہ میں قرون اولیٰ میں پھیلے ہوئے تھے، علاوہ ازیں مسجد حرام کے وجود نے خود ہی لوگوں کی توجہ اور کوششوں کو اپنی طرف مبذول کر رکھا تھا۔

حجاز کے اہم اور مشہور ترین مدارس میں مدرسۂ حجاز یہ تھا، جس کو الملک الناصر محمد بن قلاوون کی صاحبزادی نے ۷۶۱ھ میں قائم کیا تھا، اور اس میں شافعی و مالکی فقہاء کے درسوں کے لیے ترتیب مقرر کی تھی، اس میں جمعہ کے خطبہ کے لیے ایک منبر بھی بنوایا، اور پنج وقتہ نمازوں کے لیے ایک امام کا تقرر کیا۔

یہ **المدرسة المنصورية** یا **مدرسة السلطان** کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔

اسی طرح شمالی افریقہ میں بھی مدارس کا رواج ہوا، لیکن اس خطے میں مدارس کا آغاز کب ہوا، اس میں مؤرخین کے خیالات مختلف ہیں۔

کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ مغرب میں مدارس مسجدوں سے الگ ہٹ کر قائم کیے گئے، اور یہ عمل مشرق میں مدارس کے قیام کے تین صدیوں کے بعد ہوا ہے، کیونکہ مغرب میں پہلا مدرسہ تیونس میں ۶۴۷ھ= ۱۲۴۹ء میں قائم کیا گیا، اس کا نام مدرسہ شماعیہ ہے جس کو زکریا اول کی بیگم اور مستنصر باللہ حفصی کی والدہ نے قائم کیا تھا۔

اور بعض دوسرے مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ مغرب میں پہلا مدرسہ ۶۸۴ھ= ۱۲۸۵ء میں

(۱) الدارس في تاريخ المدارس: ۱/۲۵۶ (۲) مدارس مكة، از: معروف ناجی: ۱۰

تعمیر ہوا تھا، یہ مدرسۂ صفّارین ہے، جو اپنے معیار کے اعتبار سے فاس کے بنی مرین کا مشہور ترین مدرسہ شمار کیا جاتا ہے، اور یہ معلوم ہے کہ اس خاندان نے فاس اور تلمسان جیسے مغرب کے شہروں میں متعدد مدارس قائم کیے جیسے صہریج کا مدرسہ، عطاروں کا مدرسہ، اور بنوعنایہ کا مدرسہ۔

لیکن عبدالہادی التازی نامی ایک سکالر نے ان دونوں نقطۂ نظر پر اعتراض کیا ہے، اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بغداد کے مدرسۂ نظامیہ کے صرف تین سال بعد فاس ایسے مدارس سے روشناس ہو چکا تھا، جن میں بیرونی طلبہ تعلیم وتربیت حاصل کرتے، اور تحصیل علم کے لیے مختلف اطراف سے اس کا قصد کرتے تھے (۱)۔

عبدالہادی تازی نے ۴۶۲ھ = ۱۰۹۶ء کے حدود میں مرابطین کے ایک مدرسے کی نشاندہی کی ہے، جس کو امیر المسلمین یوسف بن تاشفین نے مذکورہ بالا سنہ میں اپنی فاس آمد کے بعد تعمیر کرایا تھا، انھوں نے لکھا ہے کہ اس مدرسے کے طلبہ نے موحدین کا بہت ڈٹ کر مقابلہ کیا تا آنکہ سب کے سب قتل کر دیے گئے، اسی وجہ سے اس کا نام ''مدرسۃ الصابرین'' پڑ گیا، اس مدرسہ کے کھنڈرات آج بھی نظر آتے ہیں، تازی کی اس تحقیق کی تائید ایک دوسرے محقق محمد المنوفی نے کی ہے (۲)۔

یمن میں مدارس کے نشو ونما کا سراغ عہد ایوبی کے اواخر سے ملتا ہے، یمن کے اندر اسی دور میں مدارس عملی طور پر مساجد سے الگ ہوئے، یہ اس وقت کی بات ہے جب الملک المعز اسماعیل طغتکین بن ایوب نے ۵۹۴ھ میں سب سے پہلے زبید میں مدرسے کی تعمیر کا آغاز کیا، اور اس کو المدرسۃ المعزیۃ کے نام سے موسوم کیا، اور جو بعد میں مدرسۃ المیلین کے نام سے مشہور ہوا (۳)۔

زبید اور اس کے نواح کی طرح یمن زیریں جیسے تعز، جند اور ذی جبلہ وغیرہ میں بنی رسول کے مدارس کی اشاعت ہوئی (۴)۔

بعض مؤرخین کی رائے ہے کہ یمن کے اندر حکومت رسولیہ کے عہد میں مدارس عظمت وبلندی کی انتہا کو پہنچ چکے تھے، جس وقت علمی سرگرمی عروج پر تھی، اور بڑے پیمانے پر مدارس پھیل رہے تھے (۵)۔

---

(۱) مسجد القرویین: ۲/۱۲۱-۱۲۳
(۲) العلوم والآداب والفنون علی عہد الموحدین: ۲۰
(۳) تاریخ الیمن، از: عبدالقادر مرسی۔
(۴) المدارس الإسلامیۃ في الیمن، از: اسماعیل الاکوع: ۸
(۵) تاریخ الیمن: ۲۸۲

اندلس (اسپین) میں مدراس کا نشو ونما کچھ تاخیر سے ہوا، کیونکہ وہاں سب سے پہلا مدرسہ غرناطہ میں ۷۵۰ھ = ۱۳۴۹ء میں سلطنت نصریہ (غرناطہ کی حکومت بنی احمر) کے ساتویں حکمراں ابوالحجاج یوسف اول کے عہد حکومت میں قائم ہوا تھا، اس مدرسہ کی شہرت دور دور تک پہنچی، اور اس بات پر بیشتر مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہ اندلس کا پہلا مدرسہ تھا۔

اس کے نصاب تعلیم کی ہمہ جہتی، اور دینی وفقہی علوم کے ساتھ، طب، کیمیا، فلکیات اور فلسفہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بعض مؤرخین نے اس کو غرناطہ کی یونیورسٹی کی طرح قرار دیا ہے۔

یہ مدرسہ ''مدرسۂ نصریہ'' کے نام سے موسوم تھا، اور سلطان یوسف اول کے وزیر رضوان نصری -متوفی ۷۶۰ھ = ۱۳۵۸ء- کے واسطے سے اور اس کی پیش قدمی سے تعمیر ہوا تھا[1]۔

اس سے پہلے -یعنی مدرسہ نصریہ کے وجود میں آنے سے پہلے- اندلس کے اندر تعلیم مساجد میں ہوتی تھی، اس کی تائید مقری -متوفی ۱۰۴۱ھ- کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ اندلس اس زمانے میں مدارس سے ایک دم خالی تھا، جس کا کام مساجد سے لیا جاتا تھا، مقری نے لکھا ہے کہ: ''تحصیل علم کے لیے اندلس والوں کے ہاں مدارس نہیں ہیں، بلکہ وہ لوگ ہر علم کی تحصیل مسجدوں ہی میں کرتے ہیں''[2]۔

اور کبھی کبھی کچھ اہل علم تدریس کا کام اپنے گھروں میں کیا کرتے تھے۔

مگر کچھ دوسرے مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ اندلس میں مدراس کا وجود پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) میں ہوا، لیکن وہ اس حد تک نہیں تھے کہ ان کو مطلقاً مدرسہ کہا جا سکے۔

اسی طرح اندلس کے بہت سے شہروں میں متعدد مدارس قائم ہوئے، جیسے قرطبہ، اشبیلیہ، طلیطلہ، غرناطہ، اور مالقہ وغیرہ۔

اس کے بعد اندلس کے تمام دوسرے شہروں میں بڑے پیمانے پر مدارس پھیل گئے، حتی کہ صرف غرناطہ میں بڑے مدارس کی تعداد ۱۷، اور چھوٹے مدارس کی تعداد ۱۲۰ تک پہنچ گئی۔

پانچویں صدی ہجری کے بعد عالم اسلام کے گوشے میں مدارس قائم ہونے لگے، اور مشرق سے لے کر مغرب تک پورے اسلامی ممالک میں مدارس کا جال بچھ گیا۔

(۱) مدارس مکۃ، از: معروف ناجی: ۱۴ (۲) نفح الطیب: ۲۰۵/۱

ان مدارس نے علمی سرگرمی کی ترقی، فکری بالیدگی کی حوصلہ افزائی، اور مذہبی، علمی اور ادبی ہر پہلو سے ہمارے ثقافتی سرمائے کی ذخیرہ کاری میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جس کے نتیجے میں تعلیم کی تحریک پورے اسلامی قلمرو میں غیر معمولی ترقی اختیار کرگئی۔

ان مدارس نے اپنے سروں پر لوگوں کی تعلیم، علم وفن کی مختلف شاخوں میں ان کی تربیت اور مردم سازی کی ذمہ داری اٹھالی، چنانچہ ان مدارس نے اپنے قیام کے آغاز دینی علوم کے درس مثلاً قرآن کریم اور علوم قرآن جیسے تفسیر وقرأت حدیث اور علوم حدیث، فقہ مذاہب اربعہ، عقائد اور دیگر علوم شرعیہ کی تدریس پر توجہ صرف کی۔

دینی موضوعات کی ترقی اور ان کے فروغ میں ان کا بڑا اثر پڑا، اور لوگوں کو ان موضوعات کے سمجھنے میں ان مدارس نے بہت مدد کی، اور وہ علمی وفنی تحقیقات روبہ عمل آئیں، جو اپنی گہرائی و گیرائی، سنجیدگی ونکتہ آفرینی کے لحاظ سے نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

اس کے بعد ان علمی اداروں کی طرف سے ادبی وسائنسی تحقیقات جیسے طب، ہندسہ، حساب، الجبرا وغیرہ پر توجہ کی گئی، اور ان علوم کو انتہائی بلندی تک پہنچادیا۔ اس طرح اسلامی مدارس میں علم وفن کی درج ذیل شاخیں قائم ہوگئیں:

کچھ مدارس قرآن کریم کی تعلیم، اس کی تفسیر، اور حفظ وقرأت وتجوید کے لیے خاص تھے۔

بعض مدارس آنحضرت ﷺ کی احادیث شریفہ کے لیے مخصوص تھے۔

کچھ ائمہ اربعہ کے مذہب کے مطابق فقہ کی تعلیم کے واسطے تھے۔

کچھ طب کی تعلیم کے لیے تھے، اور کچھ مدارس یتیموں کے لیے مخصوص تھے۔ اس بنیاد پر ان اسلامی مدارس کو عصر حاضر کی یونیورسٹیوں کے مشابہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

ان مدارس کے منصب درس وتدریس پر ایسے منتخب علماء اور مشاہیر فائز ہوئے، جو علمی وفنی دستگاہ میں اپنے زمانے میں ممتاز تھے۔

ان ارباب تدریس نے اپنے اپنے موضوعات کی تدریس، طالبان علم کی استعداد وصلاحیت کی ترقی، علمی تحقیقات میں ان کی دست گیری اور مختلف علمی میدانوں میں ان کی رہنمائی کے لیے ایسی قابل قدر کوششیں صرف کیں، جنھوں نے علمی میدان کے ثمرات ونتائج میں گراں قدر اضافہ کیا۔

ان مدارس سے علم کی طلب وتحصیل کرنے والوں کی اتنی بڑی تعداد فارغ ہو کر نکلی، کہ وہ پورے عالم اسلام میں پھیلے، اور ان مدارس سے جو کچھ حاصل کیا تھا اس کو دوسروں تک منتقل کرنے لگے۔

ان سے ایسی نابغۂ روزگار شخصیتیں نکلیں جنھوں نے علم وادب کے مختلف میدانوں میں اپنی مہارت کا لوہا منوایا، اور ان میں بہت سے ایسے تھے جو مختلف اسلامی شہروں میں ممتاز عہدوں پر فائز ہوئے۔

تاریخ کی کتابیں اور اسلامی سرمایہ ان درس گاہوں کے فیض یافتہ ایسے سیکڑوں ناموں کے ریکارڈ سے بھرا ہوا ہے، جن میں سے بعض شخصیتوں کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔

تاریخ فخر کے ساتھ متعدد مسلمان امراء وخلفاء کا ذکر کرتی ہے، جن کا مختلف اسلامی شہروں کے اندر مدارس کی تعمیر میں بڑا کردار رہا ہے۔

خلفاء اور امراء کے دوش بدوش اہل علم اور اصحاب ثروت وتجارت بھی مدارس کی تعمیر میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے، اور ان کی بقاء اور طلبہ کی توجہ کے لیے ان پر جائداد اور جاگیریں وقف کیا کرتے تھے، بہت سے لوگوں نے تو اپنے گھروں کو ہی مدرسہ بنا دیا، اور ان کی کتابوں اور ان سے متعلق زمینوں کو ان کے اندر تحصیل علم کرنے والے طلبہ پر وقف کر دیا۔

اس طرح یہ اوقاف ان تعلیمی اداروں کے ذرائع آمدنی ہوتے تھے، جب بھی کوئی مدرسہ قائم ہوتا، تو اس کا قائم کرنے والا اس کے لیے بہت سارے اوقاف مقرر کر دیتا، جس سے اس ادارے کی اس قدر آمدنی ہو جاتی جو اس کی بقا کی ضامن ہوتی۔

مسلم خلفاء اور حکام وغیرہ اسلامی مدارس پر خرچ کرنے اور ان کے تحفظ کے لیے اپنی زمینوں اور جائدادوں کی نگہداشت کیا کرتے تھے، جس طرح طلبہ اور معلمین کی ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے روزینے جاری کیا کرتے تھے، اس طرح یہ اسلامی مدارس علم ومعرفت کے مرکز سے اوپر اٹھ کر ایسے ادارے بن گئے جو غریبوں اور ناداروں کی مدد کیا کرتے تھے۔

اسی وقت سے ان اوقاف کا نظام جاری ہوا، جن کو اصحاب حیثیت لوگ مدارس پر خرچ کے واسطے خاص کر دیا کرتے تھے، تاکہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے سلسلے میں وہ اپنی ذمہ داری کو ادا کر سکیں۔

مدارس کا نظام تعلیم:

یہ بات پیش نظر رہے کہ مدارس اسلامیہ کے نظام تعلیم میں جس کی مثال میں مدرسہ نظامیہ کو پیش کیا جا سکتا ہے، اس نظام پر توجہ دی گئی، جس کو جامعی (ہمہ جہتی) نظام کہا جا سکتا ہے، اس کا تدریسی بورڈ -Teaching Staff- مدرسین اور معاون مدرسین سے تشکیل دیا جاتا تھا، اور مدرسہ ایسے لوگوں کا خواستگار ہوتا تھا، جو علمی میدان میں تخصص Specalization کے حامل ہوں، اور مدرس کا انتخاب ان ہی لوگوں میں سے کیا جاتا تھا، جو وفور علم، وسعت مطالعہ اور مہارت فن میں شہرت رکھتے ہوں۔

معاون کا منصب، تہذیبی کمال کی علامت ہے، جس سے تعلیم کی اہمیت اور اس کی ترقی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، اغلب یہ ہے کہ یہ منصب پانچویں صدی ہجری میں وجود پذیر ہوا (یعنی اسی وقت وجود میں آ گیا جب کہ نظامی مدارس قائم ہوئے)

وہ زندہ وتابندہ نظام جس کو اسلامی مدارس نے پیش کیا تھا، ان کا علمی ترقی میں- عالم اسلام میں خاص طور پر اور تمام عالم میں عام طور پر- نہایت خوشگوار اثر پڑا۔

علاوہ ازیں بعض مدارس اپنی عمارتوں کی وسعت، ان میں پڑھائے جانے والے علوم کے تنوع، زیر تعلیم طلبہ کے لیے دارالاقامہ (ہاسٹل)، وظائف، علاج معالجہ، اور کتاب ولباس وغیرہ کی سہولیات کی فراہمی کے اعتبار سے آج کل کے جامعات کی طرح تھے۔

ابن بطوطہ نے جن شہروں کی زیارت کی ہے ان کے مدارس اور طریقۂ تعلیم کا بھی اپنے سفر نامے میں ذکر کیا ہے، اس نے مدرسہ مستنصریہ جن کو عباسی خلیفہ امیر المؤمنین المستنصر باللہ نے ۶۳۱ھ=۱۲۳۴ء میں بغداد میں تعمیر کیا تھا، اس کی جو تفصیل بیان کی ہے، وہ کسی جامعہ (یونیورسٹی) سے مشابہ نظر آتی ہے، جس میں چار ہاسٹل تھے، ان میں سے ہر ایک اہل سنت کے کسی ایک مسلک کے واسطے مخصوص تھا، اس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد تین سو کے قریب تھی جو ان ہاسٹلوں میں تقسیم کیے گئے تھے، اور وہیں مقیم رہا کرتے تھے، ان کا قیام اور تعلیم مفت تھا، نیز ہر طالب علم کو مہینے میں ایک اشرفی (سونے کا سکہ) دی جاتی تھی۔

اطالوی مستشرق خودا بخش نے اس کے متعلق لکھا ہے: ''طلبہ کی بڑی تعداد ان اسلامی مدارس

میں رہائش پذیر رہا کرتی تھی، جن کی آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے داخلی کالجوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔‘‘(۱)

یہ اعتراف ان عظیم الشان اسلامی مدارس کے بارے میں ہے، جو یورپ کی یونیورسٹیوں کے قیام سے صدیوں پہلے عالم اسلام میں قائم کیے گئے تھے۔

ان مدارس میں جو ڈسپلین اور نظم وضبط تھا وہ بڑے عزت وافتخار کی بات ہے، ان خوبیوں کو ہم بغداد میں نظام اور مستنصر کے قائم کردہ مدرسوں، اور اس کے علاوہ شام اور مصر کے شہروں کے مدارس میں بھی محسوس کرتے ہیں۔

ان اسلامی مدارس اور جامعات کا مغرب کی بین الاقوامی یونیورسٹیوں پر دوررس اثر مرتب ہوا، وہی اطالوی مستشرق خودا بخش اس حقیقت کا اعتراف ان بلند آہنگ الفاظ میں کرتا ہے: ’’ہم اپنی یورپین یونیورسٹیوں میں اسلامی نظام کے اثرات کو واضح اور نمایاں طور پر محسوس کرتے ہیں، قرون وسطی کی اطالوی یونیورسٹیوں پر مسلمان علماء کے جو اثرات مرتب ہوئے، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یورپین یونیورسٹیوں پر اسلام کا کتنا احسان ہے‘‘۔(۲)

جہاں تک مدارس کے جائے وقوع کا تعلق ہے، تو اس کے لیے بہترین مقامات، جیسے دریا کے کناروں اور پر فضا جگہوں کا انتخاب کرتے تھے۔ کبھی ان کے گرد وپیش ایسے باغات یا سبزہ زار بنادیتے جن کے درمیان پانی کے تالاب یا حوض ہوتے، اور بسا اوقات ان کی عمارتوں کی تزئین وآرائش کا ایسا اہتمام کرتے، جو طلبہ کے اندر دلچسپی اور درس ومطالعہ واستفادہ کی تحریک پیدا کرتے۔

ابن جبیر نے اپنے سفرنامے میں عالم اسلام کے بعض مدارس کی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ موصل کے ان مدارس کے بارے میں جو دریائے دجلہ کے کنارے تھے، وہ لکھتا ہے: ’’شہر میں دجلہ کے کنارے تقریباً ٦ یا اس سے کچھ زائد تعلیم گاہیں ہیں، جو بلند وبالا محلات کی طرح نظر آتی رہتی ہیں‘‘۔(۳)

ابتدائی دور کے اسلامی مدارس کے طرز تعمیر پر مساجد کا اثر تھا، اور سوائے درس گاہوں classrooms، دار الاقامہ hostels اور اساتذہ کے رہائشی مکانات کے مساجد ومدارس کی تعمیر

(۱) مجلة التراث التربوية/ التراث التربوي في الفكر الاسلامي: ربیع الاول ۱۴۱۲ھ = جنوری ۱۹۸۲ء

(۲) حوالۂ بالا (۳) رحلة ابن جبیر: ۲/۲۲

میں کوئی نمایاں فرق نہیں تھا۔

بیشتر اسلامی مدارس، اپنی عمارتوں کی وسعت، ان کی رونق ودلفریبی، تزئین وآرائش، اور فن تعمیر کے لحاظ سے عجیب وغریب اور بلند وبالا اسلامی فن تعمیر کا نمونہ تھے۔

چنانچہ مدرسہ مستنصریہ جو ۶۳۰ھ میں بغداد میں قائم کیا گیا، اس وقت کے مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ روئے زمین پر اس وقت اس سے اچھا کوئی مدرسہ نہیں تعمیر ہوا، بے حد خوبصورت تھا، عجیب وغریب طرز اور ترتیب سے تعمیر کیا گیا تھا، عمارت اس کی فلک بوس تھی، اس کی حسن وخوبصورتی بیان سے باہر ہے، اور اپنی شہرت کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں ہے۔ (۱)

اور چونکہ کتب خانے علمی ترقی اور ثقافتی جد وجہد کے لیے ہر دور اور ہر قوم میں بنیادی حیثیت کے حامل اور ریڑھ کی ہڈی کی طرح رہتے ہیں، اس واسطے ہمارے پیش رو بزرگوں کو بھی اس حقیقت کا احساس ہوا، اور یہ سوچ کر کہ کتابیں تعلیمی سرگرمی کے لیے ایسی ضروری ہیں کہ استاذ یا طالب علم دونوں میں سے کوئی اس سے مستغنی نہیں ہے، مدارس کے قیام کی تحریک کے ساتھ ان کے اندر زیادہ سے زیادہ کتابوں کی فراہمی کی فکر بھی لاحق ہوئی، چنانچہ ہر مدرسہ میں ایک کتب خانہ بھی ہوتا تھا، جو اساتذہ وطلبہ دونوں کے لیے بحث وتحقیق اور درس ومطالعہ کے کام آتا تھا، اس کتب خانے کی نگرانی اور دیکھ بھال لائبریرین کے ذمہ ہوتی تھی، جس کا کام کتابوں کی ترتیب وتنظیم اور ان کی حفاظت کرنا ہوتا تھا۔ اس منصب پر بلند پایہ علماء وفضلا وادباء فائز اور متمکن رہ چکے ہیں۔

مختلف علوم وفنون کی تعلیم کے لیے اسلامی ممالک میں بے شمار مدارس وجامعات وجود میں آچکے تھے، اور ان تمام مدارس میں کتب خانے بھی ہوا کرتے تھے، اور ایک مدرسہ بھی ایسا نہیں تھا جس میں کتب خانہ نہ ہو۔ اور جامعات یعنی بڑے بڑے مدارس میں تو تصانیف وتالیفات اور قلمی نسخوں کا ذخیرہ ہوا کرتا تھا، اور یہ تصانیف وتالیفات ہر فن اور علم ومعرفت کی ہر قسم کے متعلق ہوتے تھے۔

(جاری ہے)

---

(۱) خلاصۃ الذہب المسبوک: ۲۱۲

بزرگان دین کے واقعات کا فائدہ
اور حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کسر نفسی

از: ڈاکٹر عبدالمعید صاحب، کھیری باغ روڈ، مئو

مشہور اہل حدیث عالم اور صاحب طرز ادیب مولانا اسحاق بھٹی تحریر فرماتے ہیں:

جماعت اہل حدیث کے نوجوان اصحاب علم کو بزرگان دین کے واقعات ضرور پڑھنا چاہئے، ان واقعات سے جہاں معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، وہاں یہ واقعات دل کی صفائی کا ذریعہ بھی ثابت ہوتے ہیں اور لکھنے والے کو نئے الفاظ اور نئے اسلوب سے بھی بہرہ ور کرتے ہیں، لیکن افسوس ہے ہماری جماعت کی موجودہ نوجوان نسل کو ان واقعات سے دلچسپی نہیں ہے، ہمارے بزرگ اس قسم کے واقعات کا بے حد شوق سے مطالعہ فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان کو اثر سے اور ان کے دل کو نرمی کی نعمت سے نوازا تھا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نہایت عجز وانکساری سے رہتے تھے۔ اگر کوئی شخص حصول رشد وخیر کی نیت سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو کسر نفسی سے فرماتے کہ میں اس قابل نہیں، کسی اور کے پاس جاؤ۔ اگر مرد کامل کا پتہ چلے تو مجھے بھی اطلاع دینا، میں بھی اس کی خدمت میں حاضری دوں گا۔ خواجہ حسام الدین بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ وہ خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گئے تو ان کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ وہ واپس آگئے اور مرشد کی تلاش میں آگرہ پہنچے، پریشانی کی حالت میں ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ کسی کو ایک مکان سے شعر پڑھتے ہوئے سنا، کان اس طرف لگائے تو شعر خواں کہہ رہا تھا:

تو خواہی آستیں افشاں وخواہی دامن اندر کش
مگس ہرگز نخواہد رفت از دکان حلوائی

یعنی تم آستین کو کھولو یا دامن اندر کو کھینچو، مکھی حلوائی کی دکان سے ہرگز نہیں جائے گی۔

اس میں خواجہ حسام الدین کے لیے استعارہ یہ تھا کہ جس طرح مکھی کے لیے حلوائی کی دکان

فائدہ مند ہے، اسی طرح تمھارے لیے وہی آستانہ نفع بخش ہے، جہاں سے تمھیں جواب ملا ہے، شعر سن کر خواجہ حسام الدین پلٹے اور سیدھے خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گئے اور اصرار کرکے ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہوئے۔ (ہفت اقلیم ص ۲۵۷-۲۵۶)

حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر و مرشد ہیں، آپ کی تواضع وفروتنی کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعات سے بھی لگایا جاسکتا ہے:

۱- ایک جوان جو حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہمسایہ تھا، ہمیشہ فسق وفجور منکرات کا ارتکاب کرتا رہتا تھا اور طرح طرح کی شرارتیں اس سے ظاہر ہوتی رہتی تھیں، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ اس کی ان حرکات ناشائستہ کا تحمل فرماتے تھے۔ ایک روز خواجہ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے اشارے پر کوتوال شہر نے اس بدمعاش کو گرفتار کرکے جیل خانہ بھیج دیا، جب یہ خبر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے سنی تو خواجہ حسام الدین کو بلا کر اس ''کارگزاری'' پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ خواجہ حسام الدین نے عرض کیا: حضرت وہ تو بڑا فاسق وشریر شخص ہے، اس کی شرارت متعدی اور متجاوز ہوچکی تھی، یہ سن کر حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آہ سرد اپنے دلِ پُر درد سے کھینچی اور فرمایا: ''ہاں بھائی جب تم اپنے کو صالح، باصفا اور اہل خیر پاتے ہو تب ہی تو تم کو وہ شخص فاسق وشریر نظر آیا، ہم تو اپنے آپ کو کسی طرح بھی اس سے ممتاز وبالاتر نہیں پاتے۔ ہم کیسے اس کے نقصان کے درپے ہوں۔'' یہ فرما کر اس شخص کو کوشش کرکے جیل خانے سے آزاد کرادیا، بالآخر وہ شخص آپ کی شفقت سے متاثر ہوکر ایک صالح ونیکوکار انسان ہوگیا۔

(تذکرہ خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ ص ۲۱، از مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی)

۲- مولانا کشمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ میں ایک مسجد میں بیٹھا ہوا تھا، میں نے سنا کہ دو درویش آپس میں گفتگو کررہے ہیں ان میں سے ایک درویش نے کہا کہ میں نے اپنی تمام عمر میں ایک عجیب وغریب متحمل مزاج انسان کو دیکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس جیسا شاید کوئی دوسرا بے نفس وبردبار انسان اس زمانے میں نہ ہوگا۔ اس کے بعد اس نے حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام مبارک لیا اور یہ واقعہ بیان کیا کہ میں قطب صاحب میں تھا۔ وہاں اطلاع پہنچی کہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ تشریف لا رہے ہیں۔ یہ سن کر درگاہ کے خادموں نے مزار کے قریب ایک جگہ پر تخت بچھایا اور اس پر فرش کرکے تکیہ رکھ دیا۔ خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی آمد آمد کی خبر سن کر یہ سب اعزاز واکرام کے انتظامات ہو ہی رہے تھے کہ ایک ''ملنگ'' کا ادھر سے گزر ہوا اس نے جب تخت وفرش بچھا دیکھا تو بے باکی سے سوال کیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

خادموں نے کہا کہ فلاں بزرگ کی آمد کے سلسلے میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ملنگ یہ سنتے ہی غصہ میں بھر گیا اور حضرت خواجہ ؒ کے حق میں نازیبا کلمات بکنے لگا، وہ بیہودہ گوئی کر ہی رہا تھا کہ اتنے میں حضرت خواجہ ؒ تشریف لائے، اب تو وہ ملنگ اور زیادہ آپے سے باہر ہو گیا اور بے باکی اور ہرزہ گوئی پر اتر آیا۔ حضرت خواجہ ؒ کے روبرو ہو کر گستاخی کرنے لگا۔ حضرت خواجہ ؒ سے مخاطب ہو کر اس نے کہا کہ اے شخص تو اس لائق ہے کہ تیرے واسطے اس جگہ فرش فروش بچھائے جائیں۔ حضرت خواجہ ؒ کے متوسلین کا ایک کثیر مجمع ہمراہ تھا۔ ان حضرات کو اس کی گستاخی سخت ناگوار گزری۔ انھوں نے چاہا کہ اس ملنگ کا مزاج درست کر دیا جائے اور اس کو احاطہ درگاہ سے نکال باہر کریں، لیکن حضرت خواجہ ؒ نے فوراً حالات کا جائزہ لے کر مجمع پر قابو پا لیا اور اپنے حضرات کو ''نگاہ خشم آلود'' سے دیکھا اور اس ارادہ سے باز رکھا اور خود اس ''گستاخ'' کے پاس آ کر نرمی کے ساتھ عذر خواہی کی اور فرمایا:

بھائی تم اچھے آدمی ہو اور میں تو واقعی اس قابل نہیں ہوں، مگر میں کیا کروں یہ سب انتظامات میرے علم کے بغیر ہوئے ہیں، مجھے بالکل خبر نہیں تھی، مجھے معاف کرو، اور میری وجہ سے خواہ مخواہ اپنے ''مغز'' کو خالی نہ کرو۔ یہ فرماتے جاتے تھے اور اس کی پیشانی سے پسینہ پوچھتے جاتے تھے، اور اس کی دلجمعی فرما رہے تھے، پھر طرہ یہ کہ چند درہم قرض لیے اور اس بے باک و گستاخ کو عنایت فرمائے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے اس وقت کوئی تغیر حضرت خواجہ ؒ کے حال و گفتار میں نہیں پایا۔ اس وقت مجھے علم ہوا کہ ایسے نفوس قدسیہ بھی اس عالم میں موجود ہیں۔ (ایضاً ص ۲۳-۲۲)

انکسار اور ''دید قصور احوال'' کا اس درجہ آپ پر غلبہ تھا کہ اگر کسی طالب سے کوئی قصور سرزد ہوتا تو فرمایا کرتے تھے کہ بھائی یہ ہماری ہی ''بد صفتی'' کے اثرات ہیں، جب کہ ہمارے اندر بدی تھی تو اس کے اندر بھی بدی کا عکس پڑ گیا بالفاظ دیگر قصور اس کا نہیں ہمارا ہی قصور ہے۔

چونکہ از راہ انکسار اپنے آپ کو عوام الناس سے ممتاز نہیں سمجھتے تھے اس لیے امر بالمعروف میں بھی سختی نہیں تھی، نرمی، ملائمت، کنایہ و تمثیل کے ساتھ امر بالمعروف فرمایا کرتے تھے یہاں تک کہ وہ بات مخاطب کے دلنشیں ہو جاتی تھی۔

کسی کی غیبت اور کسی پر تنقید آپ کی مجلس مبارک میں نہیں کی جا سکتی تھی، اگر کسی مسلمان کی تذلیل و توہین کا ارادہ بھی آپ کی موجودگی میں کسی کے دل میں گزرتا تو آپ فوراً اس مسلمان کی تعریف و توصیف بیان فرمانا شروع کر دیتے تھے۔ (تذکرہ خواجہ باقی باللہ ؒ ص ۲۲-۲۱)

(ماخوذ از ندائے شاہی)

ٹرکی کا مردِ آہن، رجب طیب اَردگان

مرتب ندائے شاہی

رمضان المبارک کے اخیر میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک مؤقر استاذ سے ملاقات ہوئی، جو اسی وقت ٹرکی کے سفر سے واپس آئے تھے، انھوں نے بہت تفصیل سے ٹرکی کی حالیہ ترقیات اور حکومتی استحکام وغیرہ امور پر گفتگو کی۔ بالخصوص ٹرکی کی موجودہ اسلام پسند قیادت اور اس کے صدر جناب رجب طیب اَردگان (حفظہ اللہ) کے بارے میں بہت امیدوں کا اظہار کیا۔ اس سے پہلے بھی متعدد حضرات کے بیانات اور اخبارات ورسائل میں چھپنے والے مضامین سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ وہ ٹرکی جو خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد ''مصطفیٰ کمال اتاترک'' کے الحاد ودہریت والے نظریات کے رنگ میں رنگین کر دیا گیا تھا، اور پوری ٹرکی قوم سے اسلامی افکار کو کھرچ دینے کی سازش رچی گئی تھی، وہ ٹرکی اب اللہ کے فضل وکرم سے عدل وانصاف اور اسلام کی راہ پر گامزن ہے۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِس مقصد کی تکمیل کے لیے جس راہنما کو منتخب فرمایا ہے، اُس کا نام ''رجب طیب اَردگان'' ہے۔

اَردگان صاحب نے ۱۵؍سال پہلے ۲۰۰۲ء میں جب زمامِ اقتدار سنبھالی، تو ان کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ وہ ترقی یافتہ ٹرکی فوج تھی، جس کی مکمل تربیت امریکہ اور اسرائیل نے کی تھی؛ لیکن اَردگان صاحب نے اس سے محاذ آرائی کا راستہ اختیار نہیں کیا؛ بلکہ حکمت وتدبر کے ساتھ ملکی معیشت کو مستحکم کرنے اور عوام کی ضرورتوں کو پورا کرنے پر اپنی توجہ مبذول کی، اور اسی دوران جیسے جیسے موقع ملتا گیا فوج کے اعلیٰ عہدوں پر ایسے افراد نامزد کیے، جو ملک اور قوم کے ساتھ ساتھ دین کے وفادار تھے، اور حتی الامکان ہر سطح پر ٹکراؤ سے گریز کیا، اور ایسی بے مثال عوامی خدمات انجام دیں کہ ٹرکی ترقی یافتہ ممالک میں ۱۸ویں نمبر پر آپہنچا، اور یوروپی ممالک کے ہم پلہ قرار پایا، اور تعلیم کا اتنا فروغ ہوا کہ ۹۸؍فیصد افراد وہاں تعلیم یافتہ بن گئے۔ اور ۸۳؍فیصد تک غربت کا خاتمہ ہو گیا، ان عظیم اقدامات کی وجہ سے ۷؍کروڑ ٹرکی عوام کی اکثریت اردگان اور ان کی پارٹی کی دل وجان سے مؤید ہو گئی، اور پے در پے انتخابات میں اردگان اور ان کی پارٹی کو بھرپور کامیابی ملی۔ اردگان کے زمانہ میں

ٹرکی کہاں سے کہاں پہنچا؟ اس کا اندازہ درج ذیل چند حقائق سے لگایا جا سکتا ہے:

(۱) اردگان کی آمد سے قبل ٹرکی حکومت پر ساڑھے تیئس بلین ڈالر کا غیر ملکی قرض تھا، جو ۲۰۱۲ء تک نہ صرف یہ کہ مکمل ادا کر دیا گیا؛ بلکہ ٹرکی نے اعلان کیا کہ: ''اَب'' آئی ایم ایف'' (عالمی قرض دینے والا ادارہ) ہم سے قرض لینا چاہے تو لے لے''۔ گویا ٹرکی کی معیشت خود اتنی مضبوط ہوگئی کہ اسے دوسروں کے سہارے کی قطعاً ضرورت نہ رہی؛ بلکہ وہ اوروں کا سہارا بننے کی پوزیشن میں آگئی، بلاشبہ یہ بڑی تبدیلی ہے۔

(۲) ۱۹۹۶ء میں ٹرکی کی کرنسی (لیرا) کی سطح اتنی گری ہوئی تھی کہ ایک امریکی ڈالر کے مقابلہ میں ۲۲۲/ لیرا ملتے تھے؛ لیکن اب ۲۰۱۶ء میں ایک ڈالر کے مقابلہ میں صرف ۳/ لیرا ملتے ہیں، لیرا کی قدر و قیمت میں یہ اضافہ ٹرکی کے استحکام اور معاشی ترقی کی واضح علامت ہے، جس سے عالمی سامراج کی راتوں کی نیند اُڑ گئی ہے۔

(۳) اَردگان جب اقتدار میں آئے، اس وقت ٹرکی کے ریزرو بینک میں صرف ساڑھے چھبیس ارب ڈالر تھے؛ لیکن ۲۰۱۱ء میں یہ مقدار ۹۲/ بلین ڈالر تک پہنچ گئی، جو انتہائی حیرت انگیز ہے۔

(۴) اَردگان نے خاص طور پر تعلیم کے شعبہ میں حکومتی اخراجات میں بے مثال اضافہ کیا، چنانچہ ۲۰۰۲ء میں تعلیم پر ساڑھے سات بلین لیرا خرچ کیے جاتے تھے، جو اب تقریباً ۴۰/ بلین لیرا تک پہنچ گئے ہیں، اور اس وقت ملک میں صرف ۹۸/ یونیورسٹیاں تھیں، جب کہ ۲۰۱۲ء میں ان کی تعداد ۱۸۶ تک پہنچ گئی۔

(۵) اطمینان بخش علاج کے لیے محکمہ صحت پر اربوں ڈالر خرچ کیے گئے، اور غریب عوام کو مفت علاج کی سہولیات فراہم کی گئیں۔

(۶) اَردگان کے دورِ حکومت میں ملک میں ۲۴/ نئے ایرپورٹ بنائے گئے، پہلے ان کی تعداد ۲۶ تھی، اب ۵۰ ہو چکی ہے۔

(۷) ۲۰۰۲ء سے ۲۰۱۱ء کے درمیان ۱۳۵۰۰/ کلومیٹر ''ایکسپریس وے'' بنائے گئے، جن سے نقل و حمل میں بڑی سہولت ہوئی۔

(۸) ٹرکی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہائی اسپیڈ ٹرین چلائی گئی، جو ۲۵۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے۔

(۹) گذشتہ آٹھ سالوں میں ۱۰۷۶رکلومیٹر کی نئی ریلوے لائنیں بچھائی گئیں۔

(بشکریہ: روزنامہ ''خبریں'' دہلی ۱۹رجولائی ۲۰۱۶ء)

یہی وہ وجوہات تھیں جن کی بنیاد پر دنیا نے ۱۵/اور ۱۶ جولائی ۲۰۱۶ء کی شب میں یہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ جب ٹرکی میں فوج کے ایک فسادی دھڑے نے بغاوت کی، اور ٹیلی ویژن سینٹر اور استنبول کے ہوئی اڈے اور پارلیمنٹ وغیرہ کا محاصرہ کرلیا، تو صدر جناب رجب طیب اُردگان کی سوشل میڈیا کے ذریعہ کی گئی ایک اپیل پر ہزاروں ترک عوام جن میں مرد وعورت، جوان بوڑھے سب شامل تھے، آدھی رات ہی میں استنبول کی سڑکوں پر آ نکلے، اور ٹینکوں کے سامنے لیٹ کر اور باغی فوجیوں سے ہتھیار چھین کر نہ صرف یہ کہ بغاوت کو ناکام کیا؛ بلکہ اپنے قائد کے حکم پر جاں نثاری اور قربانی کی ایسی تاریخ رقم کی جو کبھی بھلائی نہیں جا سکے گی۔

اس ناکام بغاوت نے اسلام دشمنوں کی امیدوں کا خون کردیا، اور وہ لوگ جو ٹرکی میں دوبارہ اتاترک کا سیاہ دور لوٹنے کا خواب دیکھ رہے تھے، ان کی صفوں میں ماتم برپا ہوگیا۔ چنانچہ جو لوگ اس دن ٹیلیویژن پر نظریں جمائے رہے، انھوں نے شہادت دی کہ جب بغاوت کی خبریں آنی شروع ہوئیں، تو مغربی میڈیا کی خوشی قابل دید تھی، باغی فوجیوں کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے جارہے تھے، اور یہ پیش گوئی کی جارہی تھی کہ جلد ہی یہ بغاوت پورے ملک کو اپنے لپیٹ میں لے لے گی، اور رجب طیب اُردگان تاریخ کا حصہ بن جائیں گے؛ لیکن کچھ ہی گھنٹوں کے بعد جب عوامی سیلاب گھروں سے بلبلوں کے مانند نکلنا شروع ہوا، اور استنبول کی سڑکیں ''نعرۂ تکبیر اللہ اکبر'' کی صداؤں سے گونجنے لگیں، اور نہتے عوام ٹینکوں کا مقابلہ کرنے لگے، اور پھر عوام کے ہاتھوں باغی فوجیوں کی دھر پکڑ اور پٹائی کا آغاز ہوا، تو مغربی میڈیا کی ساری خوشی کافور ہوگئی۔ خبریں سنانے والوں کے حلق خشک ہونے لگے، ان کی کھلتی ہوئی باچھیں سکڑ گئیں، اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہی حال دمشق میں بھی ہوا، جہاں بغاوت کے آغاز میں ظالم وجابر ''بشارالاسد'' کے حامیوں نے جشن منانا شروع کیا؛ لیکن جیسے جیسے بغاوت کی ناکامی کی خبریں آتی رہیں، سڑکوں پر سناٹا چھاتا رہا، اور ٹرکی کے مخالفین اپنا منہ پیٹ کر رہ گئے۔ سچ ہے:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن   پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

بقیہ صفحہ ۱۲ پر

وفیات

مسعود احمد الاعظمی

گزشتہ چند مہینوں میں کئی ایک شخصیتوں کی رحلت کا غم برداشت کرنا پڑا ہے، جن کی وفات سے قلب و دماغ غیر معمولی طور سے متاثر ہوا ہے۔ ان میں کئی جانے والے ایسے ہیں، جواب یاد نہیں رہ گئے کہ ان کے بارے میں لکھا جائے، چند حضرات کا تذکرہ نذر قارئین ہے۔

قاری ولی اللہ صاحب

قاری صاحب کے انتقال کی خبر بہت پہلے وصول ہوئی تھی، گزشتہ شمارے میں ان کے سانحۂ وفات کا ذکر کرنا چاہئے تھا، مگر درمیان میں رمضان اور رمضان کے بعد جلد از جلد شمارہ تیار کرنے کی فکر میں ان کے متعلق لکھنا یاد نہیں رہ سکا۔

قاری صاحب کا انتقال ۳۱؍مئی ۲۰۱۶ء بروز منگل ۴ بجے شام میں بمبئی میں ہوا، جہاں وہ برسہا برس سے مقیم تھے، اور بھنڈی بازار کی مسجد نور میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دے رہے تھے، وہ تقریباً ۶۰ برس تک اس منصب پر فائز رہے، گزشتہ کچھ عرصے سے صاحب فراش رہے، اور بالآخر ۸۲ برس کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اسی دن بعد نماز عشاء ان کے صاحبزادے قاری محبوب اللہ خاں صاحب کی امامت میں نماز جنازہ ادا کر کے تدفین عمل میں آئی۔

حضرت قاری صاحب کا تعلق مئو ضلع کے مشہور گاؤں فتح پور تال نرجا سے تھا، وہ مظاہر علوم کے فارغ التحصیل تھے، اور فراغت کے بعد پوری زندگی دین اور علم دین کی خدمت میں گزاری، متعدد مدارس اور دینی و تعلیمی اداروں کی سرپرستی کی، بمبئی کے علاوہ کوکن وغیرہ کے علاقے میں ان کی ذات سے بہت فائدہ پہنچا، ان کی دینی و تبلیغی واصلاحی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ خداوند قدوس ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات کو بلند فرمائے، اوران کی خدمات کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔

....

مولانا عبدالحفیظ رحمانی

یکم ذی قعدہ ۱۴۳۷ھ مطابق ۷؍اگست ۲۰۱۶ء کو معروف عالم دین اور مشہور مصنف مولانا عبدالحفیظ رحمانی کا سانحۂ ارتحال پیش آیا، مولانا کے انتقال کی خبر سے علمی و دینی حلقوں میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی۔ ۷؍اگست بروز سنیچر دوپہر کے وقت مولانا کے صاحبزادے مولانا حماد رحمانی کا احقر کے پاس

فون آیا کہ والد صاحب سخت بیمار ہیں، رات کے وقت دل کا دورہ پڑا ہے، اور گورکھپور کے اسپتال میں بغرض علاج داخل کیا گیا ہے۔ یہ خبر تشویشناک تھی، اور مولانا کی صحت وعافیت کے لیے دل ہی دل میں برابر دعا کرتا رہا، لیکن اسی دن مغرب کی نماز کے بعد اچانک یہ خبر برق بن کر گری کہ مولانا سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ دوسرے دن صبح دس بجے ایک جم غفیر نے نماز جنازہ ادا کرکے سپرد خاک کیا، اللہ پاک مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کی قبر کو جنت کا باغ بنائے۔

مولانا عبدالحفیظ رحمانی انتہائی متواضع، خاکسار، بے لوث اور خلیق وملنسار تھے، طبیعت میں بے پناہ سادگی تھی، خود پسندی وخودنمائی نام کو بھی نہیں تھی، سیدھے سادے اور شریف طبیعت کے انسان تھے، عالمانہ وقار اور متانت کے حامل تھے، گفتگو سلجھے ہوئے انداز میں اور ٹھہر ٹھہر کے کرتے۔

وہ ۱۹۳۶ء میں ضلع بستی -اب سنت کبیر نگر- کے ایک گاؤں لوہرسن میں پیدا ہوئے، تعلیم قدیم طرز کے مطابق حاصل کی اور دارالعلوم دیوبند سے فراغت پائی۔ فراغت کے بعد درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا تو عمر بھر یہ سلسلہ جاری رہا، مدارس اور سرکاری اسکول میں مدرسی کے علاوہ کچھ دنوں وہ شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند سے بھی وابستہ رہے۔

مولانا کا مزاج اور ذوق خالص علمی وتحقیقی تھا، مضمون نگاری، مقالہ نویسی اور تصنیف وتالیف سے ان کو خاص مناسبت تھی، ان کی تحریریں سرسری نہیں ہوتی تھیں، جو لکھتے تھے حتی الامکان تحقیق وجستجو کے بعد لکھتے تھے، انھوں نے بہت سی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، اور اکثر کتابیں نئے موضوعات اور اچھوتے عنوانات پر تصنیف کی گئی ہیں۔ ان کی تصانیف میں ''بائبل اور نبی آخرالزاں''، ''طنزیاتِ قرآنی''، ''توریت اور یہود اپنے آئینہ میں''، ''الامام النانوتوی کے مجاہدانہ کارنامے'' اور ان کے علاوہ متعدد کتابیں ہیں۔

مولانا علمی وتحقیقی مزاج کے حامل ہونے کے ساتھ مذہب ومسلک میں پختہ اور سخت تھے، اور دین ومذہب پر کسی طرح کے حملے کو برداشت کرنے کے وہ قائل نہیں تھے، وہ اپنے علاقے میں مذہب اہل سنت والجماعت اور مسلک دیوبند کے بہت بڑے حامی وناصر تھے، جمعیۃ علماء ہند سے بھی ان کی بڑی گہری اور مضبوط وابستگی تھی، ضلع جمعیۃ کے وہ موجودہ صدر بھی تھے، اس طرح وہ دینی مذہبی اور قومی وملی سرگرمیوں کی مستقل سرپرستی کیا کرتے تھے، مسلک اہل حق کے دفاع میں انھوں نے رضا

خانیوں اور غیر مقلدوں سے وقتاً فوقتاً مناظرے بھی کیے ہیں۔

حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے غایت درجہ عقیدت مند تھے، حضرت کا ذکر بڑے ہی ادب واحترام کے ساتھ کیا کرتے تھے، حضرت سے علمی استفادہ کرتے، مشکل مسائل میں رجوع کرتے، اور حضرت کا جواب ملنے کے بعد پوری طرح مطمئن ہوجاتے۔ ان کو احقر نے پہلی مرتبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اپنے زمانۂ طالب علمی میں ان کے گاؤں لوہرسن میں دیکھا تھا، انھوں نے نہایت ادب واحترام کے ساتھ حضرت کے سامنے بیٹھ کر متعدد سوالات کیے، ان ہی میں یہ بھی سوال کیا کہ آپ جب دیوبند تشریف لے گئے تو آپ نے جولکھا تھا کہ مجھے ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ میں آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں، حضرت نے پورا واقعہ بیان کیا تو مولانا نے اسی وقت اس کو اپنی ڈائری میں قلم بند کیا۔ اسی کے بعد کئی دفعہ کسی کسی مناسبت سے مدرسہ مرقاۃ العلوم میں مولانا کی تشریف آوری ہوئی، تو ان سے استفادہ کا موقع ملتا رہا۔ اسی تعلق کی بنا پر مرقاۃ العلوم، اس کے ذمہ داران اور اساتذہ ومدرسین سے بھی مولانا کے بہت گہرے روابط ہوگئے، سرپرست المآثر حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی کے ساتھ عزت واحترام اور راقم کے ساتھ حد درجہ شفقت ومحبت اور خورد نوازی کا معاملہ فرماتے تھے۔ ان کی رحلت سے نہ صرف مسند علم وتحقیق خالی ہوئی ہے۔ بلکہ ادارہ المآثر ومرقاۃ العلوم اور اس کے وابستگان کو بھی سخت صدمہ پہنچا ہے، اللہ رب العزت مولانا کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات کو بلند کرے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے۔

چھوٹے ماموں حاجی سعید احمد صاحب

دل ودماغ کی دنیا کو متاثر کرنے والے صدموں میں نہایت سخت صدمہ راقم کے چھوٹے ماموں حضرت حاجی سعید احمد صاحب کی وفات کا ہے، جو تقریباً اڑھائی مہینے کی علالت کے بعد ۱۵؍ ذی قعدہ ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۹؍ اگست ۲۰۱۶ء کو جمعہ کے روز مغرب کی نماز کے کچھ دیر بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ کر عالم آخرت کی طرف روانہ ہوگئے اِنا للہ واِنا اِلیہ راجعون۔

گزشتہ کچھ برسوں سے وہ کسی نہ کسی عارضے میں مبتلا رہا کرتے تھے، چند مہینے پہلے جسم میں خون کی کمی ہوگئی تھی، جس کی وجہ سے بہت کمزور اور نڈھال ہوتے جارہے تھے، علاج ہوتا رہا اور بوقت ضرورت خون چڑھایا جاتا رہا، اور قدرے شفایاب ہوجاتے، لیکن رمضان کے اوائل میں بستر پر

پڑے تو پھر اٹھ نہ سکے، بنارس لے جائے گئے، وہاں ڈاکٹر نے چیک اپ وغیرہ کیا تو گردے کا عارضہ بتلایا، علاج مستقل اور نہایت تندہی سے ہوتا رہا، لیکن جانبر نہ ہوسکے، اور جان جان آفریں کے سپرد کی۔ انتقال کے دوسرے دن مرحوم کے بڑے بھائی اور حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی دامت برکاتہم کی امامت میں جم غفیر نے نماز جنازہ ادا کی، اور آبائی قبرستان واقع لب دریا میں تدفین عمل میں آئی، نماز جنازہ میں شہر مئو کے علاوہ قرب وجوار کے قصبات سے بھی بڑی تعداد میں لوگ خصوصاً اہل علم شریک ہوئے۔ اب حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے تین صاحبزادوں اور سات صاحبزادیوں میں دو بقید حیات رہ گئے ہیں، اللہ تعالی ان کی عمروں کو دراز فرمائے اور ان کے سائے کو تادیر باقی رکھے، آمین۔

چھوٹے ماموں حاجی سعید احمد صاحب علیہ الرحمۃ کی عمر انتقال کے وقت اسی برس رہی ہوگی۔ ان کی ولادت اور نشو ونما دینی و مذہبی وعلمی ماحول میں ہوئی، اور یہ ماحول ان کے اوپر اثر انداز ہوا، زمانہ طالب علمی میں امراض وعوارض میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے وہ تعلیم مکمل نہیں کر سکے، مزاج دینی تھا، اور فرائض کے علاوہ اوراد وظائف کے بھی پابند تھے، تلاوت پابندی سے کرتے تھے، متعدد بار حج وعمرہ کی سعادت سے بھی بہرہ مند ہو چکے تھے۔

حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے جب مدرسہ مرقاۃ العلوم قائم کیا، تو مدرسہ ومسجد کی تعمیر کی دیکھ بھال نہایت تندہی اور حسن وخوبی کے ساتھ کرتے رہے، اور اس کی تعمیر وترقی اور پروان چڑھانے میں کوشاں رہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد اپنے بڑے بھائی حضرت مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ کے دست وبازو بنے رہے۔

دراز قد، مضبوط جسم اور چوڑے بدن کے انسان تھے، لیکن بیماری کی وجہ سے وہ اندر ہی اندر کھوکھلے ہوتے جارہے تھے، ان کے انتقال سے جو خلا واقع ہوا ہے، وہ آسانی سے پر ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔

پسماندگان میں پانچ صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں ہیں، اہلیہ کا انتقال کئی سال پہلے ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے۔

ایک روح فرسا حادثہ

عیدالاضحیٰ کے روز ایک نہایت اندوہناک خبر ملی کہ مولانا حافظ عبدالحي مفتاحی صدر جمیعۃ علماء ضلع مئو وناظم مدرسہ منبع العلوم خیرآباد کے صاحبزادے اور مولانا عبدالرب صاحب ناظم مدرسہ انوارالعلوم جہاناگنج ونائب صدر جمیعۃ علماء اترپردیش کے بھانجے وبھتیجے سعودی عرب میں کار کے ایک حادثے میں جاں بحق ہوگئے، إنا لله وإنا إليه راجعون۔ دونوں جاں بحق ہونے والے اوران کے ساتھ کئی احباب جوآپس میں سب رشتہ دار تھے سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں مقیم تھے، اور عیدالاضحیٰ کی تعطیل میں عمرہ کی نیت سے ریاض سے مدینہ منورہ اور وہاں سے مکہ کے لیے نکلے تھے، نصف شب میں ان لوگوں نے راستے میں القسیم میں کھانا کھایا، اور وہاں سے روانہ ہوگئے، گاڑی چلانے والے کوراستے میں نیند کی جھپکی آئی، اور گاڑی راستے کے درمیان میں بنے ڈیوائیڈر سے ٹکرا گئی۔ مولانا عبدالحی صاحب کے صاحبزادے سعیدالحق صاحب جومولانا عبدالرب صاحب کے بھانجے بھی ہیں، اور مولانا عبدالرب صاحب کے ایک بھتیجے موقع پر ہی انتقال کرگئے، ضابطہ کی کارروائی کے بعد وہیں نماز جنازہ ادا کی گئی، اور اسی مقدس سرزمین میں پیوند خاک ہوگئے، اس حادثے میں دیگرافرادزخمی ہوئے ہیں، جن میں بعض شدیدزخمی ہیں، ناظرین دعافرمائیں کہ جولوگ قضاکرگئے اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرمائے، زخمیوں کوشفائے کامل وعاجل عطافرمائے، اور پسماندگان کوصبرجمیل کی توفیق عنایت فرمائے، آمین۔

....

مولانا مقبول احمد صاحب

۱۴ر ذی الحجہ ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۷ر ستمبر ۲۰۱۶ء بروز سنیچر علی الصباح یہ افسوسناک خبر ملی کہ حضرت مولانا قمرالزماں صاحب دامت برکاتہم کے بڑے صاحبزادے مولانا مقبول احمد صاحب کئی مہینے کی علالت کے بعد سفرآخرت پرروانہ ہوگئے، إنالله وإناإليه راجعون۔

مولانا مرحوم نیک، صالح اورخوش اخلاق وملنسار تھے، الہ آباد میں راقم کی ان سے بارہا ملاقات ہوئی، اور ہرملاقات میں انھوں نے حسن اخلاق کا مظاہرہ کیا، طبیعت میں سادگی اورمتانت تھی، ان کے کتب خانے میں کتابوں کاایک اچھاذخیرہ ہے، جس میں بہت سی نئی مطبوعات اورمراجع

کی کتابیں موجود ہیں۔ ایک دفعہ ان کے کتب خانے کی ایک کتاب کی راقم کو زیروکس درکار تھی، تو انھوں نے بغیر کسی تردد کے خوشی کے ساتھ اس کی زیروکس کی اجازت دے دی۔

راقم نے حضرت مولانا امام الدین پنجابی کی ایک کتاب البلاغ المبین کی تحقیق وتعلیق کی خدمت انجام دی تھی، تو مولانا مرحوم ہی نے اس کے نشر واشاعت کا اہتمام کیا تھا۔

وہ مدرسہ ومسجد اور اس جیسے دیگر امور کے انتظام وانصرام میں حضرت مولانا قمرالزماں صاحب کے دست راست تھے، اور ان کی وجہ سے مولانا بہت ساری فکروں سے آزاد تھے، اس لیے ان کا انتقال مولانا کے لیے اس پیرانہ سالی میں دوہرے صدمے کا باعث ہے، اللہ سے دعا ہے کہ ان کا نعم البدل عطا فرمائے، ان کی مغفرت فرمائے، حسنات کو قبول فرمائے، اور خطاؤں سے درگزر فرمائے، اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

....

مفتی محمد ظہور ندوی صاحب

۲۲ / ذی الحجہ ۱۴۳۷ھ = ۲۵ / ستمبر ۲۰۱۶ء کی صبح میں یہ دل گداز خبر وصول ہوئی کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے معمّر مفتی اور موقر عالم مولانا مفتی محمد ظہور ندوی کا قریباً ۸۹ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

مفتی صاحب کی جائے پیدائش مبارک پور سے قریب ایک گاؤں ہے، جہاں ۱۹۲۷ء میں ان کی ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی، ۱۹۴۴ء میں ندوہ چلے گئے، اور تحصیل علم سے فراغت کے بعد ندوے میں ہی ۱۹۵۲ء میں بحیثیت استاذ ان کا تقرر عمل میں آیا، فقہ وافتاء سے ان کو خاص مناسبت تھی، اور اس میدان میں وہ بلند مقام تک پہنچے، درس وتدریس اور تعلیم وتربیت کا اللہ نے ان کو خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، حد درجہ متواضع اور منکسر المزاج تھے، فتویٰ نویسی میں طویل تجربہ اور مہارت رکھتے تھے، ان کی رحلت سے جہاں علمی دنیا میں ایک خلا واقع ہوا ہے، وہیں دارالعلوم ندوہ اپنے ایک لائق فرزند اور کہنہ مشق وتجربہ کار استاذ کی خدمات سے محروم ہوگیا ہے، اللہ رب العزت مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے، ان کی حسنات کو قبول فرمائے، اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔